ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

۵ دسمبر ۱۹۹۵ء

☆ پاک و ہند تجارتی روابط . . . . مدو جزر کے مختلف ادوار : تجزیہ

☆ مصر کے سفارت خانے میں بم دھماکہ . . . . پس پردہ حقائق ، واقعات عالم

☆ امریکہ میں یہودیوں کے خلاف کٹر عیسائیوں کا ردعمل : پس منظر

حدیثِ امروز

مذہبی جماعتوں کے خلاف حکومتی کارروائی

اسلام آباد میں ۱۹ / نومبر کو مصر کے سفارت خانہ کی بم سے تباہی کے بعد پاکستان کی حکومت نے فوری ردعمل کے طور پر مذہبی سیاسی جماعتوں کے خلاف کارروائی شروع کی ہے جس میں وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں لائی گئی ہیں۔ دوسری طرف "ملی یکجہتی کونسل" کے جھنڈے تلے یہ جماعتیں حکومت کے خلاف میدان میں آنے کے لئے پر تول رہی ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو اس سے یقیناً اپوزیشن کو فائدہ پہنچے گا جو کافی عرصے سے حکومت مخالف تحریک شروع کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اس طرح ممکن ہے کہ یہ بھی ۱۹۷۷ء کی "تحریک نظام مصطفیٰ" کی سی شکل اختیار کر لے۔ یہ سارے امکانات حکومت کے علم میں ہوں گے اور اس نے اس کے لئے پیش بندیاں کر رکھی ہوں گی جیسا کہ ابھی سے باخبر حلقے صدر راج یا ایمرجنسی کے نفاذ کی پیشین گوئی کر رہے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کبھی کسی حکومت نے اپنے کھاتے میں کوئی اچھا کام نہیں دکھایا جس کے بل پر اسے کہیں سے تائید حاصل ہونے کی امید ہو۔ چنانچہ ایک ہلکے سے عوامی ریلے کے آگے بڑے بڑے حکومتی پشتے تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ مگر یہ سارا عمل کسی فلم کے سین یا ایک ڈرامے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لوگ خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بازی جیت لی اور چند دنوں میں ایک جمی جمائی حکومت کو چلتا کیا۔ حکومت خود بھی اس ڈرامے میں سنسنی پیدا کرنے کے لئے آخر وقت تک میدان مار لینے کے دعوے کرتی رہتی ہے تاکہ اسے حقیقت کا رنگ دیا جا سکے۔ لیکن جب کھیل ختم ہوتا ہے اور عوام کا وقتی جوش و جذبہ سرد پڑنے لگتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ وہی جاگیردار اور سرمایہ دار چہرے بدل کر اگلی مدت کے لئے تخت حکومت پر براجمان ہیں۔ جو چہرے حکومت میں تھے وہ لندن اور پیرس میں جا کر تکان دور فرمائیں گے اور وہاں سے تازہ دم قائدین اس دوران حکومت کرنے یہاں تشریف لے آئیں گے۔ عوام کو اس ساری بھاگ دوڑ اور نعرے بازی کے صلے میں سب سے پہلا "مژدہ" یہ سنایا جاتا ہے کہ "خزانہ خالی ہے"۔ کچھ سعید روحیں اس "جدوجہد" میں جان کا نذرانہ پیش کر کے اللہ کے ہاں اجر پانے پہنچ جاتی ہیں اور قوم اپنی مشقت میں اضافہ کروا کر اسی معاش کے چکر میں جت جاتی ہے۔ پہلے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے کچھ نہ کچھ ظاہری تبدیلی کا اہتمام کیا جاتا رہا تھا اور ہر دفعہ کوئی نیا قائد اور مرد مومن منظر عام پر لایا جاتا تھا مگر اب نظر آتا ہے کہ کچھ عرصہ تک اقتدار کا جھولا مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان ہی جھولتا رہے گا۔

مذہبی سیاستدان حضرات کی یہ خواہش یا مطالبہ کتنا ہی مبنی برحق کیوں نہ ہو کہ اب انہیں اقتدار میں آنے کا موقع ملنا چاہئے' اس کے پورا ہونے کی سردست امید نظر نہیں آتی (واللہ اعلم)۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان حضرات کی "حصہ بقدر جسہ" نمائندگی ہر دور حکومت میں رہی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عوام کی بہت بڑی اکثریت تاحال اس بات سے ناواقف چلی آ رہی ہے کہ علماء کرام کے ہاتھ میں حکومت آ جانے سے سیاسی' معاشی اور سماجی سطح پر کیا تبدیلی رونما ہو گی۔ تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عوام نے اسلام کے حوالے سے تحریک پاکستان اور نظام مصطفیٰ کی تحریک میں زبردست قربانیاں دیں مگر ان کی تقدیر بدلتی تو کیا' ہر دفعہ آسمان سے گرا' کھجور میں اٹکا والا معاملہ رہا۔ گو اس میں نہ سارا قصور علماء کرام کا ہے اور نہ یہ ہے کہ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

قیمت : ۸ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الھدیٰ

اور جو لوگ منکر ہیں ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے دشت بے آب میں سراب کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے ہوئے تھا' مگر جب وہ وہاں پہنچا تو کچھ نہ پایا' بلکہ اپنے پاس موجود پایا اس نے اللہ کو جس نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا۔ اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی○

(کہ اللہ کی میزان میں وہی عمل وزن رکھتا ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو' جو خالصتاً اللہ ہی کے لئے کیا گیا ہو اور اس کی جزاء آخرت میں مطلوب ہو' دیگر تمام اعمال خواہ اپنے حجم میں وہ کوہ ہمالیہ کے ہم پلہ نظر آتے ہوں' اللہ کی میزان میں رائی کے ہم وزن بھی نہیں۔ تو کیا حسرتناک انجام ہو گا ان لوگوں کا جو اپنی دانست میں تو ڈھیروں نیکیاں لے کر عدالت اخروی میں پیش ہوں گے لیکن ایمان و اخلاص کے فقدان کے باعث وہاں وہ تمام اعمال ھباء منثورا ثابت ہوں گے اور ان کے لئے میزان تک نصب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی جائے گی)

حافظ عاکف سعید

یا پھر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرے ہوں' کہ اوپر چڑھی آتی ہے ایک موج' اس پر ایک اور موج' اس کے اوپر بادل بھی ہیں۔ تاریکی پر تاریکی مسلط ہے' آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھ پائے۔

(اور وہ بدبخت کہ جن کی زندگی میں نیکی کا سرے سے گزر ہی نہیں' جو محض ہوا و ہوس کے غلام ہیں' ان کی تیرہ بختی کے لئے کس قدر بلیغ تمثیل ہے کہ کسی شب تاریک میں سمندر کی گہرائیوں میں مطلق تاریکی کی وہ کیفیت کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے' یہی مثال ہے ان کافروں کی جن کی زندگی جھوٹ موٹ کی نیکی سے بھی تہی ہے)

اور جسے اللہ ہی نور نہ بخشے' اس کے لئے پھر کوئی نور نہیں!○

(جو اپنی بداعمالیوں کے سبب اللہ کی بارگاہ سے مسلوب التوفیق قرار دے دیا گیا ہو اس کے لئے اب کہاں کی روشنی اور کیسا نور!)

(سورۃ النور' آیات ۳۹' ۴۰)

جوامع الکلم

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے

(اس دنیا میں انسان اپنی بدنیتی اور اپنے مذموم عزائم پر حسن عمل کے کتنے ہی پردے ڈال لے' اللہ سے اس کے ارادے مخفی نہیں' چنانچہ اخلاص نیت سے محروم ہر عمل' خواہ بظاہر وہ بہت بڑا نیکی کا کام نظر آتا ہو' روز قیامت منہ پر دے مارا جائے گا۔ ہاں "جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے"۔)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

دارالمطالعہ قرآن اکیڈمی
۹۵-۱۲-۲۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

بانی مدیر: اقتدار احمد مرحوم

جلد ۴ شمارہ ۴۹

۵ دسمبر ۱۹۹۵ء

17

مدیر: حافظ عاکف سعید

معاون مدیر: نثار احمد ملک

○

یکے از مطبوعات
تحریک خلافت پاکستان

۴۔ اے' مزنگ روڈ' لاہور

○

مقام اشاعت
۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون: ۳-۵۸۶۹۵۰۱

○

پبلشر: محمد سعید اسعد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع: مکتبہ جدید پریس' ریلوے روڈ لاہور

○

قیمت فی پرچہ: ۸ روپے
سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۵۰ روپے

○

زرتعاون برائے بیرون پاکستان
☆ ترکی' اومان' مصر ۱۳/امریکی ڈالر
☆ سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر' عرب امارات' بھارت' بنگلہ دیش' یورپ' جاپان ۲۰ امریکی ڈالر
☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ ۲۶ امریکی ڈالر

ایڈیٹر کے ڈیسک سے!

پاکستان اور بھارت کے مابین تجارتی تعلقات کا استوار ہونا ایک بڑا حساس موضوع ہے۔ پاکستان کے صنعت کار اور تاجر طبقے کی اکثریت ہی نہیں' ہمارے اہل فکر و نظر کی ایک بڑی تعداد بھی اس کی شدید مخالف ہے اور اسے ملکی مفاد کے خلاف سمجھتی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ تجارت پر عائد موجودہ پابندی اٹھالی جائے۔ اس کا اصل سبب پاک و ہند تعلقات کی مخصوص نوعیت ہے جسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا' ورنہ کون نہیں جانتا کہ دو طرفہ تجارت کبھی بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتی۔ تجارت کے نتیجے میں یقینی طور پر ملکی معیشت کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرز فکر کے حامل لوگوں کا خیال یہ ہے کہ بھارت کے ساتھ تجارتی روابط استوار کرنے کا خیال ہمیں اپنے دل سے نکال دینا چاہئے کہ ع "ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!"

تاہم ہمارے ملک کے مخلص اہل دانش اور ماہر اقتصادیات کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جو اس خیال کا پرزور حامی ہے کہ ہمیں بلاتاخیر بھارت کے ساتھ تجارتی روابط استوار کرنے چاہئیں اور اس ضمن میں جن خدشات اور اندیشوں کا اظہار دوسرے مکتب فکر کی جانب سے کیا جاتا ہے' انہیں خاطر میں نہیں لانا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ خدشات اور اندیشے دراصل ہماری حد سے بڑھی ہوئی حساسیت کا مظہر ہیں۔ ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ بھارت کے ساتھ تجارتی روابط کی بحالی ہرگز ملکی مفاد سے متصادم نہیں ہے بلکہ اس کے نتیجے میں ہمیں اپنی معاشی حالت کو سدھارنے میں مدد ملے گی۔ اس خیال کی پرزور تائید جناب جاوید انور کے ایک مضمون سے ہوتی ہے جو ۷ جولائی کو روزنامہ جسارت کے فرائیڈے اسپیشل میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو ان شاء اللہ "ندائے خلافت" کے آئندہ شمارے میں جگہ دی جائے گی۔ تاہم زیر نظر شمارے میں اس ضمن میں ایک نہایت قیمتی مضمون "پاک و ہند تجارتی روابط... مدوجزر کے مختلف ادوار" کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے جسے سارک چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے سابق صدر جناب ایس ایم انعام صاحب نے "ندائے خلافت" کے لئے تحریر کیا ہے۔ محترم انعام صاحب نے جو ہماری تاجر برادری میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں' اپنے مضمون میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۹۵ء تک یعنی تقسیم سے لے کر آج تک' پاک و ہند تجارتی روابط میں اتار چڑھاؤ کی جو کیفیت رہی ہے اس کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔ اور اس تناظر میں اس اہم مسئلے کا عمدگی سے تجزیہ کیا ہے کہ ہندوستان سے تجارتی روابط کی بحالی ملکی معیشت کے حق میں مفید ثابت ہوگی یا مضرت بخش!... ہمیں یقین ہے کہ قارئین اس مضمون کو نہایت دلچسپ اور معلومات افزا پائیں گے۔ بالخصوص یہ معاملہ کھل کر قارئین کے سامنے آئے گا کہ ہندوستان کے ساتھ تجارت شروع کرنے کی بات آج کسی انوکھے ذہن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی انداز میں تجارتی تعلقات ہر دور میں انڈیا کے ساتھ استوار رہے ہیں۔ بے قاعدہ اور بے ضابطہ تجارت یعنی اسمگلنگ تو مسلسل بلا روک ٹوک جاری ہے ہی' باضابطہ سرکاری سطح پر تجارت بھی اس سے قبل مختلف ادوار میں ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ اسے کفر اور اسلام کا مسئلہ قرار دینا ہرگز حقیقت پسندانہ روش قرار نہیں دیا جاسکتا۔

☆ ☆ ☆

ندائے خلافت کے گزشتہ شمارے میں اعلان کیا گیا تھا کہ آئندہ شمارے میں امریکی معاشرے کے نئے رجحانات' بالخصوص وہاں یہودیوں کے خلاف عیسائیوں کے ردعمل کی تفصیلات پر مشتمل بعض اہم مضامین کا اردو ترجمہ خلاصے کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ ان مضامین کا حوالہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے ایک حالیہ خطاب جمعہ میں دیا تھا۔ اس مکمل خطاب کی پہلی قسط اب دسمبر کے میثاق' میں شائع کی جارہی ہے۔ حسب وعدہ مذکورہ بالا مضامین کا ملخص زیر نظر شمارے میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح عالمی احیاء خلافت کانفرنس میں شرکت کے لئے امریکہ سے تشریف لانے والے دو نمایاں مذہبی رہنماؤں امام جمیل الامین اور جناب عیسیٰ عبدالکریم کا بھرپور انٹرویو بھی زیر نظر شمارے میں قارئین کی نگاہوں سے گزرے گا۔ OO

پاک وہند تجارتی روابط... مدوجزر کے مختلف ادوار

یہ خدشہ کہ ہندوستان سے تجارتی روابط استوار کرنے سے ہماری مقامی انڈسٹری ختم ہو جائے گی، قطعی بے بنیاد ہے!

ایس ایم انعام' سابق صدر سارک چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری

ہندوستان کی تحریک آزادی انگریز کا تسلط ختم کرانے کے لئے تھی۔ اس تحریک میں پہلے تو تمام قوتیں یعنی ہندو اور مسلمان یکجا تھے۔ پھر اس میں مسلم قوتیں اپنے لئے ایک علیحدہ ملک کی جدوجہد کرنے لگیں۔

انگریزوں کو بھی ہندوستان چھوڑنے میں ایسی عجلت تھی۔ انہوں نے ایک طرف تو لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا اور دوسری طرف یہ جانتے ہوئے بھی کہ آزادی کی خواہش مند دونوں اقوام ہندو و مسلمان کسی طرح سے بھی سول ایڈمنسٹریشن' پولیس فورس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو کنٹرول اور ان سے کام لینے کا تجربہ نہیں رکھتیں' انہوں نے ایسی فضا بنا دی کہ آزادی کی نوید کے ساتھ ساتھ سارے ہندوستان میں ابتری و افراتفری پھیل گئی۔ کسی بھی سیاسی پارٹی کے پاس ایسی صورتحال سے نپٹنے کے لئے کوئی حکمت عملی نہ تھی نہ ہی وہ ایسی صورتحال کو کنٹرول کرنے کے تجربہ سے آشنا تھے۔

ملک کی تقسیم میں وہ ابتری پھیلی کہ توبہ بھلی۔ مختلف قومیتوں میں نفرتیں نقطہ عروج کو پہنچا دی گئیں۔ جانے والے حاکم اپنے پیچھے آگ و خون کی ایسی ہولی رچا گئے کہ قتل و غارت اور لوٹ مار سے زندگیاں بچانے کے لئے انسانوں کے لئے ہجرت ہی ایک صورت رہ گئی۔ قافلے بنے' چلے' لٹے۔ لٹے پٹے لوگ دونوں جانب سے رواں دواں ہو گئے۔ انسان نہ جانے کیسے گھاس پھوس' پتے کھا کر زندگیاں بچاتے ہوئے ہندوستان سے پاکستان اور اسی طرح پاکستان سے ہندوستان پہنچا۔

ضروریات زندگی کی کمی اور اشد ضرورت۔

حالات ناگفتہ بہ!

تجارتی منڈیاں اجڑ چکی تھیں!

ہر چیز کے حصول کے لئے راشن کارڈ کے اجراء کا عمل اور مخصوص مقدار میں گندم' آٹا' چاول' چینی' گھی اور نہ جانے کس کس چیز پر کنٹرول نافذ ہوئے!

ہندوستان میں اتنی قلت ایک بڑے ملک ہونے کی وجہ سے نہ محسوس کی گئی۔ وہاں ایک مکمل صنعتی نظام موجود تھا لیکن پاکستان کے متعلق تو اندازے لگنے لگے کہ جلد ہی واپس ہندوستان میں ضم ہو جائے گا اور اگر ضم نہ بھی ہوا تو شاید چند برس ہی چلے گا۔ اور تو اور بعض مسلم کانگریسی لیڈران نے یہ پیش گوئی بھی کر دی کہ پاکستان بمشکل تمام پچاس سال نکالے گا۔ لیکن ان تمام ابتر حالات اور مشکلات سے گھرا ہوا ملک ایک بے ضابطہ (informal) تجارت کے سہارے چل پڑا جس سے امید کی شمع روشن رہی کہ ہمیں تجارتی قوتیں سنبھالا دیں گی۔

شروع کے سالوں میں تو ہندو پاک کے درمیان باقاعدہ (formal) اور بے ضابطہ (informal) تجارت پاکستان کی 90 سے 95 فیصد تک ضروریات پورا کرتی رہی۔ باقاعدہ تجارت میں اگرچہ بڑے مدو جزر آئے لیکن حکومتی سطح پر بہرحال قائم رہی۔ البتہ بے ضابطہ تجارت اپنی جگہ چٹان کی طرح موجود رہی اور اس میں شاید ہی کوئی جزر آیا ہو۔

1952ء تک کے سال پاکستان کی معیشت کے خوشحال سال رہے۔ کوریا کی جنگ اور ہندوستان سے مال کی آمد نے ہمیں بڑا حوصلہ اور جلا دی۔ لیکن ہماری اپنی غلط منصوبہ بندی اور ناتجربہ کاری سے "مندی" چھا گئی۔ 1952ء ہی میں امپورٹ ایکسپورٹ کے قوانین نافذ کرنا پڑے۔ ایک بارڈر ٹریڈ ایگریمنٹ انڈیا سے بھی کیا گیا۔ (پاکستان کے اس قسم کے سرحدوں پر تجارت کے معاہدے چین' ایران اور شاید افغانستان سے بھی ہیں)

1965ء میں ہندوستان کے ساتھ باقاعدہ ٹریڈ پر مکمل پابندی نافذ ہوئی۔ لیکن دوسرے پہلو والی تجارت یعنی اسمگلنگ کسی بھی ضابطہ میں نہ آ سکی۔ بقول شخصے "کام چلتا رہا"۔ تاشقند کا معاہدہ بھی ہندوستان سے تجارتی روابط بحال کرنے میں ناکام رہا۔

شملہ معاہدہ کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے درمیان 1974ء میں ایک تجارتی پروٹوکول پر دستخط ہوئے۔ دونوں ملکوں کے درمیان سرکاری سطح پر مخصوص گورنمنٹ ایجنسیوں کو منتخب اشیاء کی لسٹ سے امپورٹ کرنے کی اجازت دی گئی۔

1975ء میں اس منتخب لسٹ کو فائنل کیا گیا اور اس میں پرائیویٹ سیکٹر کو بھی 1976ء میں شامل کیا گیا اور پھر اچانک یہ لسٹ ہی کیا مکمل طور پر ہندوستان سے تجارت 1978ء میں بند کر دی گئی۔ 1978ء میں بندش سے قبل ہندوستان سے رکشا پاکستان میں در آمد ہونے شروع ہوئے تھے وہ بھی اسی بندش میں شامل ہو گئے۔

ہندو پاک کے تاجر و صنعت کاروں نے اپنے تئیں تجارت کرنے کی سعی کی اور 1981ء میں پاکستان سے ایک تجارتی وفد ہندوستان گیا اور وہاں دہلی میں ایک نمائش میں شامل بھی ہوا۔ 1982ء میں پنجاب' ہریانہ دہلی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کا ایک تجارتی وفد پاکستان آیا۔ اور یہاں اس نے کراچی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری سے باہمی تعاون (Mutual cooperation) کا معاہدہ کیا۔

تجارتی تنظیموں کے اصرار اور پریشر کی بنا پر ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان (TCP) کی وساطت سے 42 آئٹم کی امپورٹ کا ہندوستان سے فیصلہ کیا گیا اور اس ذریعے سے پرائیویٹ سیکٹر کو ایک مخصوص فیس کے عوض امپورٹ کی اجازت دی گئی۔

1983ء میں پاک و ہند کے درمیان ایک بزنس کمیشن تشکیل دیا گیا جس کے تحت 249 آئٹمز کی لسٹ تشکیل دی گئی اور یہ تمام آئٹمز پرائیویٹ سیکٹر کی امپورٹ کے لئے مختص کی گئیں اور اس سے باقاعدہ امپورٹ شروع ہوئی۔ 1986ء میں جناب دی پی سنگھ جو اس وقت ہندوستان کے کامرس اور فنانس منسٹر

تھے' پاکستان تشریف لائے۔ یہاں ان کی گفتگو اس وقت پاکستان کے کامرس منسٹر محبوب الحق صاحب سے ہوئی۔ جس کے نتیجے میں تجارت اور معاشی معاملات (Trade and Economic Affairs) کو وسعت دینے کا فیصلہ ہوا۔

1988/89ء کی تجارتی پالیسی کی بنیاد پر انڈیا سے امپورٹ لسٹ میں 322 مزید آئٹمز کا اضافہ کیا گیا جس سے فائنل لسٹ 571 آئٹمز کی ہو گئی۔ اس اضافہ سے یقینی طور پر حسب ضابطہ تجارت میں اضافہ ہوا۔ پاکستان کی اپنی تجارت 1987/88ء کے 301 ملین روپے کے مقابلے میں 1.21 بلین روپے ہو گئی جبکہ انڈیا نے بھی اپنی تجارت پاکستان سے بڑھائی جو 1987/88ء میں 484 ملین روپے تھی اور اضافی آئٹمز آ جانے سے 1988/89ء میں 2.81 بلین روپے ہو گئی۔ تجارتی خسارہ ہندوستان اور تجارت کا بیلنس پاکستان کے حق میں رہا۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اتنی لمبی لسٹ میں سے جو کہ 571 (اور اب 575) آئٹم پر مشتمل تھی پاکستان صرف 10 آئٹم کی مارکیٹنگ کر سکا جو کہ ان اشیاء پر مشتمل ہے۔ خام پیٹرول' روئی' پھل' سبزیاں' چمڑا' مصنوعی ریشے کا کپڑا' سوتی کپڑا' دھاگہ' اون' اور معدنی نمک۔

اس کے مقابلے میں ہندوستان بھی صرف 14 چیزیں پاکستان کو ایکسپورٹ کر سکا جن کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔ خام لوہا' سبزیاں' مصنوعی رنگ و روغن' روغنی بیج' مشینیں اور ان کے پرزے' مسالہ جات' کیمیائی مادے' چھپا ہوا سامان' تیار شدہ بنیادی دھاتیں' چائے' کھلونے' انڈور گیمز' کھیل کا سامان اور پھل۔

1987ء کا سال پاکستان کے لئے Economic Liberalization یعنی معاشی فراغی کا سال کہلاتا ہے۔ جب یہ دور شروع ہوا تو صنعتی و تجارتی برادری میں اس بات کا عام چرچا اور اظہار ہونا شروع ہو گیا کہ پاکستان کو سارک

(SAARC-South Asia Association for Reginol Copperation)

ممالک اور خصوصاً ہندوستان سے بھی کم از کم سارک کے حوالے سے تجارتی پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔ اور ہمیں انڈیا سے باقی سارک ممالک کے لئے زمینی راستوں (Land Routes) سے تجارتی روابط بڑھانے کے لئے سہولتیں مانگنا چاہئیں۔ اس ضمن میں محکمہ ایکسپورٹ پروموشن (Export Promotion) سے ایک رپورٹ تیار کرنے کے لئے کہا گیا جو درج ذیل چھ "انتہائی سہولت کے مخصوص عوامل"

(Specific Factors of Extreme Convenience)

کو مد نظر رکھتے ہوئے تجارتی ماحول کو سازگار بنانے کی سفارش کرے۔ یہ چھ نکات کچھ یوں تھے :۔

(i) NO LANGUAGE PROBLEMS
(زبان کا کوئی مسئلہ نہیں)

(ii) SHORT DISTANCE WITH LESSER FREIGHT COST
(کم فاصلے جس کی بنا پر باربرداری کا کم خرچ)

(iii) QUICK DELIVERIES LEADING TO SHORT INVENTORIES
(مال کی فوری دستیابی' لہٰذا کم سے کم اسٹاک رکھنے کی ضرورت)

(iv) FAMILIARITY WITH EACE OTHER'S TRADE PRACTICES, FASHIONS AND NEEDS
(ایک دوسرے کے تجارتی چلن' فیشن اور ضرورتوں سے واقفیت)

(v) LESSER DAMAGE TO GOODS IN TRANSIT
(راستے میں سامان کے نقصان کا کم سے کم احتمال)

(vi) COMPLEMENTARINESS IN SEVERAL AREAS.
(متعدد میدانوں میں باہمی کمی کو پورا کرنے کی صلاحیت)

معلوم نہیں کہ اس پیپر کی تیاری کس STAGE پر ہے۔

1988ء میں سارک چیمبر کے لئے داغ بیل ڈالنے کی تدابیر پرائیویٹ سیکٹر میں شروع ہو گئیں۔

دہلی میں 77۔G چیمبرز کی جنرل کونسل کی میٹنگ میں پاکستانی وفد نے ایک یادداشت تیار کی جس میں سارک ممالک کی تاجر برادری اپنے لئے ایک فورم (forum) سارک چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے نام سے بنائے گی اور اس طرح کوشش کی جائے گی کہ سارک ممالک کی تنظیم میں تجارت و معاشی معاملات بھی شامل کرائے جائیں۔ اس سال سارک سیکریٹریٹ نے ایک مطالعاتی (Study) گروپ تشکیل دیا اور اس کی سفارشات کی بنا پر سارک ممالک کی 1988ء کی ڈھاکہ میں سربراہی ملاقات میں نہ صرف معاشی معاملات کو ریویو کیا گیا بلکہ سارک چیمبر کو ایک سال کے لئے چوٹی کی تنظیم (Apex Body) کی حیثیت سے تسلیم بھی کر لیا گیا۔ اس کے اہداف میں سے ایک شق کے مطابق تجارت میں سہولتیں دینے اور آپس میں تجارت بڑھانے کے لئے محاصل (tarrif) میں بھی تخفیف کے ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ جو اب "SAPTA" یعنی سارک ایگریمنٹ آف پریفرنشل ٹریڈنگ ارینجمنٹ

(SAARC agreement of preferential trading arrangement)

کے نام سے مشہور ہے۔ 7/ نومبر 1995ء کو ساتوں ممالک بنگلہ دیش' بھوٹان' انڈیا' مالدیپ' نیپال' پاکستان اور سری لنکا کی حکومتوں نے SAPTA کے معاہدے کی تصدیق کر دی ہے۔ اور 8/ دسمبر 1995ء تک اس کے اطلاق کی تاریخ مقرر کی گئی ہے جو سارک ممالک کی تنظیم کی دسویں سالگرہ کا دن بھی ہے۔

اس معاہدے کے تحت ان ممالک نے مخصوص آئٹمز کی درآمد و برآمد طے کر لی ہیں اور اسی طرح ان منتخب اشیاء پر ڈیوٹی کی کمی بھی معاہدے کے مطابق طے پا چکی ہیں۔ ہندوستان باقی چھ ممالک سے 106 آئٹمز درآمد کرے گا اور ان پر رعائتی ڈیوٹی (Conecessional Duties) چارج کرے گا۔ اس طرح پاکستان ان چھ ممالک سے 35 آئٹمز رعائتی ڈیوٹی (Conecessional Duties) کے تحت درآمد کرے گا۔ یوں ہندوستان کا ایک بڑے ملک کی حیثیت سے ایک بڑی لسٹ پر ڈیوٹی میں کمی ایک اچھی پیشکش ہے اور پاکستان کے برآمد کنندگان کے لئے ایک اچھا موقعہ ہے جس سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے۔

اس بات کی بھی بازگشت سنی جا رہی ہے کہ ہندوستان کے صنعت کاران 106 آئٹمز پر سارک کے چھ ممالک میں مشترکہ منصوبے (Joint venture) بھی شروع کرنے کو تیار ہیں۔ امید ہے کہ پاکستان کے حکومتی حلقے قوانین میں مناسب ترامیم کریں گے تاکہ صنعتی اور تجارتی فضا میں گھٹن کم ہو اور آپس میں تعاون کی فضا بحال ہو۔ پیشتر اس کے کہ باقی ممالک اس صورت حال سے فائدہ اٹھائیں نئی صدی میں داخل ہونے کے لئے اب ان سارک کے ممالک میں فری ٹریڈ ایگریمنٹ کرنے کی باتیں بھی ہونے لگی ہیں۔

SAPTA اور پھر

SAFTA (SAARC Agreement For Free Trading Arrangement)

دونوں معاہدے یقینی طور پر سارک ممالک کے درمیان ایک بہت بڑی پیش قدمی اور break through ہیں۔ سارک کے پروگرام کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں دو طرفہ معین تجارتی سودے بھی ہو رہے ہیں۔ سال 93/94 میں پاکستان نے ہندوستان کو خصوصی تجارتی انتظام کے تحت بیس ہزار ٹن شکر فروخت کی اور وہاں سے دو سال 93/95 کے درمیان ایک بار بیس ہزار ٹن اور پھر اسی ہزار ٹن سیمنٹ خریدا۔ اور اب آلو' دالیں اور دیگر خوردنی اشیاء کی خرید کا پروگرام زیر غور ہے۔

یہ بات بھی ہندو پاک کی تجارت کے سلسلے میں مشاہدے میں آ چکی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اب ہندوستانی مصنوعات دبئی' ہانگ کانگ اور سنگاپور سے پاکستان میں امپورٹ ہو رہی ہیں۔ ان میں زیادہ تر صنعتی یونٹ ہیں اور مشینیں ہیں۔ چھوٹے اسکیل کے صنعتی کارخانوں کی مشینوں کی درآمد سے پاکستان کو صنعتی سرمایہ کاری (Industrial Capital Investment) میں خاصی بچت ہوئی ہے یعنی ہم نسبتاً کم سرمایہ کاری سے صنعتیں قائم کرنے کے قابل ہوئے ہیں کیونکہ ہندوستانی ساخت کی مشینیں کم قیمت پر دستیاب ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ WTO یا اس سے پہلے گاٹ (GATT) جن پالیسیوں پر عمل درآمد کرتے یا کرانا چاہتے ہیں وہ ترقی پذیر (under development) ممالک کے لئے کس حد تک منافع بخش تھے یا ہیں۔ اگر جنوبی ایشیا کے ممالک SAPTA اور SAFTA کے ذریعے تجارتی رشتے استوار کرتے ہیں تو یقیناً ایک بہت بڑی منڈی وجود میں آتی ہے۔ شاید دنیا میں اتنی بڑی آبادی یعنی 1.3 بلین اغلباً چین میں ہی ہے۔

اس بات میں کچھ حیرانی نہیں کہ پاکستان آنکھیں بند کئے ہوئے نہ جانے کون سے خدشات میں کھویا ہوا ہے۔ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا غیر تحریری (un-written) معاہدہ بھی اپنی جگہ پر مکمل طور پر عمل پذیر (operational) ہے جس کے تحت 1995ء میں پاک و ہند کی بے ضابطہ (Informal) تجارت شاید US $ 1.50 بلین کی حد سے تجاوز کر جائے۔ ہمارے کتنے لوگ اس بات کو جانتے ہیں کہ جو گوشت ہم کھاتے ہیں اور جس کے کم ہونے کی وجہ سے ہفتہ میں دو اور اب تین دن ناغہ ہونے لگ گیا ہے۔ اس کی بڑی مقدار ان مویشیوں سے حاصل ہوتی ہے جو اس غیر رسمی تجارت کے ذریعہ ہندوستان سے آتے ہیں۔ اگر یہ مویشی درآمد نہ ہوتے تو یہاں شاید گوشت 400 روپے کلو سے بھی مہنگا ہوتا! کیا اس آئٹم کے آنے سے ہمارے ہاں افزائش نسل کے تمام یونٹس بند ہو گئے ہیں یا انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے؟ کیا آج ہندو پاکستان کی مارکیٹوں میں ایک دوسرے کا بنایا ہوا کپڑا بنانے والے ملک کے نام سے نہیں بکتا؟ کیا اس سے ہماری یا ہندوستان کی (Textile Industry) بند ہو گئی؟ جبکہ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ ہندوستانی خریداروں نے روس کو سپلائی مکمل کرنے کے لئے پاکستانی ٹیکسٹائل ہانگ کانگ اور سنگاپور کے ذریعے خریدیں کیونکہ ہندوستان کی پروڈکشن اتنی نہ تھی جتنے ان کے پاس ایکسپورٹ آرڈرز تھے۔

پاکستان میں اس بات کے خدشات ہمیشہ رہے کہ اگر ہندوستان سے تجارتی روابط بڑھ جائیں گے تو ہماری مقامی انڈسٹری جو ابھی بالکل نومولود ہے ختم ہو جائے گی۔ یہ عجیب سا خدشہ ہے۔ کیا پاکستان میں چائے کی امپورٹ سری لنکا اور بنگلہ دیش کی بجائے کینیا سے کر لینے سے سری لنکا اور بنگلہ دیش میں چائے اگانا چھوڑ دی گئی؟ ان ممالک نے نئی منڈیاں تلاش کیں اور اپنے ایکسپورٹ کو جاری رکھا۔ لیکن پاکستان کے صنعتی حلقہ نے ان دوست ممالک کی طرف بھی نہیں دیکھا جن کے یہاں امپورٹ فری تھی اور کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ بنگلہ دیش ایک اچھی مثال ہے جس کی فری امپورٹ لسٹ 4 بلین ڈالر کی ہے۔ ہم نے اس مارکیٹ میں کیا نفوذ کیا ہے؟ انڈیا کو لے لیں اس کی 27 سے 30 بلین ڈالر کی امپورٹ ہے جو سینکڑوں آئٹمز پر مشتمل ہے۔ وہاں 70 سے 75 کروڑ انسان بستے ہیں۔ پاکستان نے وہاں کتنی رسائی حاصل کی ہے؟ یہ باضابطہ تجارت کے لئے ایک اشارہ ہے' بے ضابطہ تجارت تو اپنا رول ادا کرتی رہے گی۔ پاکستان کو ان مارکیٹوں کی طرف دیکھنا چاہئے۔ مجھے 1947ء سے پہلے کا زمانہ یاد آتا ہے جب سیالکوٹ کا کھیلوں کا سامان سارے ہندوستان پر چھایا ہوا تھا۔ اسی طرح وزیر آباد کے چاقو چھریاں' گکھڑ کی دریاں اور گوجرانوالہ کے برتن تمام ہندوستان میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے۔

اگر پاکستانی تاجر اور خصوصیت سے صنعت کار محنت کرے' بین الاقوامی قیمتوں میں مسابقت کر سکے اور اپنی اشیائے فروخت کا معیار برقرار رکھے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم نہ صرف بیرونی منڈیوں میں ہندوستان کے مقابلہ میں اپنا جائز مقام حاصل کر سکیں بلکہ خود ہندوستان سے تجارت کو بھی اپنے ملک اور پاکستانی صارفین کے لئے نفع بخش بنا سکیں۔

☆☆☆

ٹھٹھہ (سندھ) سے ایک فریاد

بخدمت اقدس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد خیریت مطلوب' گزارش ہے کہ ادارہ ہذا انجمن و تنظیم اسلامی کے پرانے اراکین میں سے ہیں۔ گزشتہ ۲۴۔۲۳ ستمبر ۹۵ء کی شب نامعلوم مجرموں نے مکی مسجد ڈیرو ضلع ٹھٹھہ سندھ کے خطیب و معمر عالم دین مولانا عبدالحلیم دامت برکاتہ کی رہائش گاہ واقع مکی مسجد کے احاطہ میں داخل ہو کر گھر کا پورا سامان لوٹ لیا ہے۔ ایف آئی آر درج کی گئی مگر تاحال مجرموں کا سراغ نہ مل سکا ہے۔

آپ سے پرزور درخواست ہے کہ آپ صدر' وزیر اعظم' وزیر داخلہ' گورنر و وزیر اعلیٰ سندھ سے رابطہ فرمائیں اور ان کے آگے احتجاج فرمائیں۔ نیز احتجاجی مراسلے بھی ارسال فرمائیں۔ امید ہے کہ آنجناب اس مد میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ جواب کے لئے منتظر ہیں۔

ڈاکٹر اللہ ڈینو میمن

ڈیرو' ضلع ٹھٹھہ' سندھ

امریکہ میں یہودی عمل دخل کے خلاف کٹڑ عیسائیوں کا ردعمل!

یہ تحریکیں امریکی وفاق کی تحلیل کا پیش خیمہ ہیں؟

دائیں بازو کے متعدد گروہ یہودیوں اور اس کی آلہ کار وفاقی حکومت کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں

دو واقعات ایسے ہوئے ہیں جن کے سبب انتہائی دائیں بازو کے گروہ کھل کر وفاقی حکومت کے خلاف صف آرا ہو رہے ہیں۔ ایک "اڈاہو" (Adaho) کے سفید فام علیحدگی پسند رانڈی ویور (Randy Weaver) کی وفاقی ایجنٹوں کے ساتھ ۳۱ اگست ۱۹۹۲ء کی مڈبھیڑ' جس میں اس کی بیوی' چودہ سالہ بیٹا اور ایک امریکی مارشل کام آئے اور دوسرا واکو (Waco) ٹیکساس میں واقع "داودی" مرکز پر ۱۹/ اپریل ۱۹۹۳ء کو ایف۔ بی۔ آئی کا دھاوا جس میں ۷۰ داودی اپنے مسکن سمیت جل کر راکھ ہو گئے۔ اکثر گروہ وفاقی حکومت کو یہودی قبضہ گروپ کی حکومت (Zoinist occupational Government) تصور کرتے ہیں۔ اپریل ۱۹۹۵ء میں اوکلاہاما کا بم دھماکہ اور گذشتہ روز اریزونا کا ریل حادثہ جس میں ایک شخص ہلاک اور ایک سو زخمی ہوئے' اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ چنانچہ بلیک فٹ اڈاہو کی امریکی ملیشیا ایسوسی ایشن کے سموئیل شیرووڈ (Samuel sherwood) کا کہنا ہے کہ "خانہ جنگی دور نہیں جس میں اڈاہو کے قانون سازوں کو گولی کا نشانہ بنانا ہو گا"۔

انتہائی دائیں بازو کے یہ گروہ اصلاً وفاقی حکومت اور یہودیوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ وفاقی حکومت وہ "خونخوار درندہ" ہے جس پر بدکردار یہودی سوار ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آزاد خیال اونچا طبقہ روایتی امریکی اقدار کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہے۔ اقوام متحدہ کی حیثیت اس "ٹروجی گھوڑے" کی ہے جو قوموں کو اندر ہی اندر ناکارہ بنانے میں کام آتا ہے۔ وفاقی رزرو بینک' بلکہ تمام بینک' جی۔ ایم۔ اے' نافٹا اور گیٹ وغیرہ "نیو ورلڈ آرڈر" کے سامنے امریکہ کی شکست کے مظہر ہیں۔ امریکی دستور میں ترمیم ثانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی رو سے دستور اور شہری آزادی کے تحفظ کے لئے بعض مسلح گروہ قائم کرنے ضروری ہو گئے ہیں جبکہ قانونی ماہرین اسے "ریاست گردی" کا نام دیتے ہیں۔

ٹائم میگزین نے اپنی ۸ مئی ۱۹۹۵ کی اشاعت میں ان سات بڑے بڑے گروہوں کے نام گنوائے ہیں جو اس وقت وفاقی حکومت اور یہودیوں کے خلاف میدان میں ہیں۔

۱۔ آرین اقوام (Aryan nations) : یہ ہیڈن جھیل' اڈاہو کے قریب واقع اپنے آپ کو اعلیٰ نسل شمار کرنے والے سفید فاموں کا گروہ ہے۔ ریو رچرڈ بٹلر اس کے سربراہ ہیں۔

۲۔ بقا پسند (Survivatists) : یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ خوراک' پانی' اسلحہ اور گولہ بارود ذخیرہ کر کے حکومت اور معاشی نظام کا تیا پانچا کیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ اڈاہو' شمالی کیلیفورنیا اور مونٹانا کے غیر آباد علاقوں میں اپنی پناہ گاہیں تلاش کر رہے ہیں۔

۳۔ وطن دوست (Patriots) : یہ وفاق مخالف سرگرم عمل افراد کا جال ہے۔ یہ لوگ آئین کی دسویں ترمیم کو اجاگر کرتے ہیں' جس کی رو سے ایسے اختیارات جو وفاقی حکومت کو منتقل نہیں ہوئے' ریاستوں اور عوام کو حاصل ہیں۔

۴۔ ملیشیاز (Militias) : ایسے مسلح گروہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ آئین خطرے میں ہے لہٰذا اس کی حفاظت کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔

۵۔ عیسائی شناخت (Christian identity) : ایسی تحریکیں جن کے نزدیک شمالی یورپ کے رہنے والے ہی عہد نامہ قدیم (Old testament) کے بتائے ہوئے برگزیدہ لوگ ہیں اور یہودی شیطان کی اولاد ہیں۔ یہی گروہ وفاقی حکومت کو "Zoinist Occupatinal Government" کا نام دیتا ہے۔

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

۶۔ خدائی خدمت گار (Posse comitatus) : یہ ٹیکس مزاحم تحریک ہے' جس میں بہت سے وسطی یورپ والے شامل ہیں جو ۱۹۸۰ء کے زرعی بحران کا نشانہ بنے تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آئی۔ آر۔ ایس بین الاقوامی صیہونی بینکاروں کا آلہ کار تھا۔

۷۔ دانش مند فرقہ (Wise use) : مغرب میں قائم یہ تحریک جسے کان کنی اور عمارتی لکڑی کا کاروبار کرنے والی کمپنیوں کی مالی امداد حاصل ہے' وفاقی اراضی پر مویشی چرانے اور وہاں سے معدنیات نکالنے پر عائد پابندی ہٹوانے کے لئے کوشاں ہے۔

اب ان گروہوں کے اغراض و مقاصد کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔

عالم بالا کے قریب (Almost heaven) : کیداہو' اڈاہو' تقریباً ۳۰ گھرانوں کا ایک مسلح گروہ' جس کی قیادت بوگرٹز (Bo gritz) کر رہے ہیں اپنے خود کفیل ہونے اور تمام قوانین کے اندر اندر رہنے کی توقع رکھتے ہیں بشرطیکہ یہ قوانین اللہ کے احکامات اور عقل سلیم کے خلاف نہ ہوں۔ گرٹز لکھتا ہے "جن ظالموں نے ویورز اور واکو پر حملے کا حکم دیا تھا ان کے خلاف مقدمہ چلا کر انہیں اس جرم کی پاداش میں سولی پر لٹکانا چاہیے۔!!"

مونٹانا کا ملیشیا : ناکسن' مونٹانا کھلا انتہا پسند ملیشیا جس کا قائد جان ٹروچ مین ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شہریوں کو اپنے تحفظ کے لئے منظم ملیشیا قائم کرنا چاہیے۔

مشی گن ملیشیا کور : یہ لوگ ہاربر سپرنگز۔ مشی گن میں اپریل ۱۹۹۴ میں آتشیں اسلحہ پر پابندی کے خلاف عمل میں آیا۔ اس کا خیال ہے کہ اقوام متحدہ امریکہ کو عالمی سوشلسٹ حکومت کا درجہ دینا چاہتی ہے۔ اس کا

دعوی ہے کہ اس کے ارکان کی تعداد ۱۲ ہزار ہے۔

امریکی جسٹس فیڈریشن : (انڈیانا پولیز) یہ جماعت انڈیانا میں اٹارنی لنڈا تھامپسن کی سربراہی میں داؤدی فرقے کے خلاف حملے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ مقصد نیو ورلڈ آرڈر کی روک تھام اور امریکی عوام کو حقائق سے روشناس کرانا ہے۔ انہوں نے واشنگٹن پر مسلح چڑھائی کرنے اور کانگریسی غداروں کے خلاف مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا۔

امریکی عوام کی آزادی کے نگہبان : بولڈر۔ کولوریڈو۔ سربراہ سٹیوارٹ وب۔ دائیں بازو کے ریڈیو پروگراموں میں سازشی نظریات کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ ان کا مقصد بدعنوانی سے پاک حکومت کی یقین دہانی اور امریکی آئین کی محافظت ہے۔

ٹیکساس دستوری ملیشیا : ۱۹۹۴ء کے شروع میں جان رولنڈ نے قائم کیا۔ اس کا بچھایا ہوا خفیہ E میل جال زیر زمین معلوماتی رابطے کا کام انجام دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اسے حکومتی الیکٹرانک جاسوسی کے محکمے تک رسائی حاصل ہے۔

فلوریڈا ریاستی ملیشیاء : رابرٹ پیومر نے قائم کیا۔ اس کے دستور العمل کے مطابق "بہت ہو چکا' منشیات اور جرائم' تشدد اور خونریزی' واکو اور امریکی عیسائیوں پر حکومت کے حملے' یہ سب کچھ بہت ہو گیا۔ لہٰذا "اسلحہ جمع کرلو بعد میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گا"۔

جماعت برائے بحالی آئینی حکومت : مزو' نارتھ کیرولینا۔ چار "بی" اس کا نشان ہے۔ یعنی بائبل' بلٹ (گولی)' بین (سر) اور بینڈجز (پٹیاں) اس گروہ کے پیش نظر بائبل اور امریکی آئین کو قانون the land Law of کا درجہ دلانا ہے۔

نیلی چوٹی شکار کلب (Blue ridge hunt club) : ورجینا۔ اس گروہ کا مقصد اپنے ارکان کو حکومت کے خلاف مسلح کرنا ہے۔

دفاع آئین ملیشیاء : نیو ہیمشائر۔ ایڈورڈ براؤن کی سرکردگی میں قائم یہ چھوٹا مگر اچھی طرح منظم گروہ اسلحہ پر پابندی' اقوام متحدہ اور وفاقی حکومت کے خلاف ہے۔

اوپر بیان کی گئی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت' سیاستدانوں اور بیرونی اثرات کے بارے میں عدم اطمینان کی کیفیت پہلے سے موجود تھی البتہ اس میں رینڈی ویور اور واکو کے واقعات نے شدت پیدا کی ہے۔ ان تحریکوں کے روح رواں زیادہ تر بنیاد

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

لنڈن ایچ لاروش جونیئر

ماہر معاشیات اور سیاسی مدبر لنڈن لاروش گزشتہ دو دہائیوں سے ایک نہایت ہی متنازعہ عالمی شخصیت کے طور پر منظر عام پر رہے ہیں۔ وہ عالمی مالیاتی نظام میں ایسی دور رس تبدیلیاں لانے کے لئے مہم چلا رہے ہیں جن سے تیسری دنیا کے ممالک کو مساوی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے بین الاقوامی منشیات کے کاروبار میں ملوث بڑے بڑے گروہوں کو بے نقاب کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ ۸ ستمبر ۱۹۲۲ء کو راجسٹر' نیو ہیمپشائر کے ایک عیسائی مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ باپ کا تعلق فرانس سے اور ماں کا انگریز اور سکاٹ کی ملی جلی نسل سے تھا۔ میساچوسٹ کے پبلک سکول سسٹم میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۴۲۔۱۹۴۰ء اور ۴۷۔۱۹۴۶ء تک نارتھ ساؤتھ یونیورسٹی میں داخل رہے۔

دوسری جنگ عظیم میں چین' انڈیا' برما محاذ پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ بعد میں جوتے بنانے والے ایک ادارے سے بطور صنعتی مشیر منسلک ہوئے۔ ۲۹/ دسمبر ۱۹۷۷ء کو جرمن سیاسی لیڈر اور معروف مصنفہ ہلگارڈ سے جو شلا انسٹی ٹیوٹ اور انٹرنیشنل کلب آف لائف کی بانی ہیں' شادی کی۔ ۱۹۷۶' ۱۹۸۰' ۱۹۸۴' ۱۹۸۸' اور ۱۹۹۲ء کے امریکہ کے صدارتی انتخابات میں بطور امیدوار حصہ لیا۔ ڈاک سے متعلق دھوکہ دہی کے ایک مقدمے میں سزا بھی پائی۔ ان کے خلاف ایسے گیارہ مقدمات قائم کئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ۲۹۴،۰۰۰ ڈالر قرض کی عدم ادائیگی اور محکمہ مال کے کام میں رکاوٹ پیدا کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ ان الزامات کی بنیاد پر انہیں ۲۷/ جنوری ۱۹۸۹ء کو جیل بھیج دیا گیا جہاں سے جنوری ۱۹۹۴ء میں پیرول پر رہائی ملی۔ حال ہی میں عدالت کے ریکارڈ سے پتہ چلا ہے کہ حکومت کی طرف سے پیش کردہ شہادتیں ظاہر کرتی ہیں کہ حکومت امریکہ پہلے دن سے جانتی تھی کہ لاروش اور اس کے ساتھ دوسرے لوگوں کو ناکردہ گناہ کی پاداش میں جیل بھیجا گیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ امریکہ اپنی اقتصادی پالیسی میں عرصہ ہوا' آزادی سے محروم ہو چکا ہے۔ وفاقی آئین کی دفعہ ۱ اور اس سے آگے شق ۸ کی رو سے امریکی حکومت اپنی کرنسی جاری کرنے اور اسے کنٹرول کرنے میں ہر لحاظ سے آزاد اور خود مختار تھی لیکن ٹیڈی روز ولٹ اور وڈرو ولسن نے بینکاروں کو اس میں ملوث کر کے اپنی آزادی ناجائز طور پر ایک نجی ادارے کے ہاں گروی رکھ دی' جس کے نتیجے میں امریکی کرنسی اور کریڈٹ کا کنٹرول امریکی حکومت کی بجائے بینکاروں اور بین الاقوامی سرمایہ کاروں کے ایک گروہ کے ہاتھ میں جا چکا ہے۔

دوسری اہم بات وہ یہ کہتے ہیں کہ جان ایف کینڈی کے قتل کے بعد سے امریکہ میں پالیسی ساز اداروں پر راگ' رنگ' نشے اور فحاشی کی ثقافت کا راج ہے۔ یہ ثقافت یہودی سازش کے تحت برطانیہ میں پروان چڑھی اور وہاں سے امریکہ میں درآمد ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے خاندانی اقدار ملیامیٹ ہو چکی ہیں۔ ناجائز اولاد کی بھرمار معاشرے کیلئے بہت بڑا مسئلہ بن چکی ہے۔

تیسری بات یہ کہ کاغذوں میں ہماری قوم ایک دستوری جمہوریہ ہے لیکن لگ بھگ ایک سو سال سے حقیقت اس کے برعکس ہے' تھیوڈور روز ویلٹ کے عہد صدارت میں لائی جانے والی تبدیلیوں کے سبب صورت حال یکسر بدل چکی ہے۔ حکومتی پالیسیاں' وفاقی حکومت کے اہم مناصب کے لئے تقرریاں اور رائے عامہ کا تعین ایک پس پردہ کمیٹی انجام دیتی ہے۔ جسے اسٹیبلشمنٹ "establishment" کا نام دیا جاتا ہے۔ اہم حکومتی مناصب کے لئے امیدوار باقاعدہ اس کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر اجازت حاصل کرنے کے بعد میدان میں آتے ہیں اور کامیاب ہو کر اسٹیبلشمنٹ کی طے کردہ پالیسیوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

لاروش کا کہنا ہے کہ عوام پر اونچے طبقے کی بالادستی ہمیشہ رہی ہے گو اس صورت حال کو تبدیل کرنے میں امریکی انقلاب ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن جب تک عوام کی بھاری اکثریت قومی سطح پر اونچے طبقے کے مقابلے میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے آگے نہیں آتی' صحیح معنوں میں جمہوریت وجود میں نہیں آسکتی' لہٰذا ایک مخلص قیادت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو حقائق سے آگاہ کرے اور انہیں اپنے حقوق کے حصول کے لئے تیار کرے' چنانچہ ان کی تمام تر جد و جہد امریکی انقلاب کے اصل ثمرات لوگوں کو واپس دلانے کے لئے ہے اور غالباً یہی ان کا وہ جرم ہے جس کے لئے انہیں وقفے وقفے سے جیل کی ہوا کھانا پڑتی ہے۔OO

مصر کے سفارت خانے میں بم دھماکہ... پس پردہ حقائق!!

اسلام امن و آشتی کا درس دیتا ہے لیکن .....

مصر سمیت تمام مسلمان ممالک میں دینی عناصر پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں

بنیاد پرست مسلمانوں کے خلاف ہونے والی تازہ کارروائیوں کی سرپرستی مغربی ممالک کر رہے ہیں

سردار اعوان

اسلام آباد میں ۱۹ نومبر کی صبح بموں کے ذریعے مصر کے سفارت خانہ کی تباہی پر جس میں ایک اخباری اطلاع کے مطابق ۱۸ افراد موقع پر جاں بحق اور ۹۰ زخمی ہوئے ہیں' ہر باشعور پرامن شہری صدمہ اور تشویش محسوس کرے گا۔ یہ بات خاص طور پر گہرے غور و خوض کی متقاضی ہے کہ دین اسلام کے ماننے والے جو سراسر بھلائی اور سلامتی کا دین ہے' آج کیوں سب سے زیادہ ایسی کارروائیوں میں ملوث ہو رہے ہیں۔ اگرچہ عیسائیت کے پرچارک بھی "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق اب دہشت گردی پر اتر آئے ہیں جس کا آغاز امریکہ میں اوکلاہاما کے بم دھماکہ سے ہو چکا ہے جس میں کہا جاتا ہے کم و بیش ۲۰۰ افراد جن میں بچے اور عورتیں شامل تھیں' ہلاک ہوئے۔ تاہم اب تک ایسی کارروائیوں کے لئے جنہیں "دہشت گردی" کا نام دیا جاتا ہے مسلمان ہی بدنام ہیں کیونکہ اس میں اکثر بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں۔

اسلام بلاشبہ پوری نوع انسانی کے لئے امن و سلامتی اور عدل و قسط کی ضمانت فراہم کرتا ہے مگر یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس مقصد کے لئے پورے کے پورے اسلام کو لینا ہو گا۔ اسلام میں جہاں ایک انسانی جان دنیا کی ہر شے سے زیادہ محترم اور عزیز ہے وہاں حکمرانوں کے لئے بھی حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مثالیں پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک عظیم انسان اسلامی ریاست کا سربراہ' خلیفہ المسلمین کی جان بلوائیوں کے ہاتھوں خطرہ میں ہے۔ اس کے ایک اشارہ پر مسلمان افواج بلوائیوں کی تکا بوٹی کر سکتی ہیں لیکن خلیفہ المسلمین اپنی جان کی حفاظت کی خاطر کسی ایک شخص کو بھی حراست میں لینے کا حکم صادر کرنے کے لئے تیار نہیں' یہاں تک کہ بلوائی انہیں شہید کر دیتے ہیں۔

اس تناظر میں مصری حکمرانوں اور وہاں کے اندرونی حالات کا ایک جائزہ لینا بے جا نہ ہو گا۔ اس لئے بھی کہ مصر کے صدر حسنی مبارک اس وقت دہشت گردی کے خلاف دنیا کے سب سے بڑے چیمپئن بنے ہوئے ہیں' لندن سے شائع ہونے والے مشہور عالمی جریدہ "امپیکٹ انٹرنیشنل" کے نومبر

> "درحقیقت ہمارے مسلمان حکمران انتہائی بدعنوان' نااہل' ظالم اور ناعاقبت اندیش ثابت ہوئے ہیں جنہیں نہ اپنے عوام سے دلچسپی ہے اور نہ ہی ان کو اپنی آخرت کی کوئی پرواہ ہے"

۱۹۹۵ء کے شمارہ میں "مصر پر مبارک کی حکومت ہے یا مافیا کی؟" کے عنوان سے طویل بحث شائع ہوئی ہے جس میں مصر کے حالات کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ ان رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے بدعنوان اور جابر حکمران ٹولے کے ہاتھوں کوئی بھی اسلام پسند شخص اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کرتا۔ ان کا نعرہ ہی یہ ہے کہ "مذہب کا مطلب انقلاب"! لہٰذا مذہب سے ہماری جنگ ہے۔ خفیہ ادارے "مباحث" کے اہلکار جسے چاہیں اٹھا لے جاتے ہیں جس کے خلاف کسی عدالت میں شنوائی نہیں۔ مذکورہ جریدے میں متعدد ایسی مثالیں پیش کی گئی ہیں' مثلاً ایک وکیل' عبدالحارث مدنی کو ۲۶ / اپریل ۱۹۹۴ء کو حراست میں لیا گیا اور اس کے چند روز بعد اس کی لاش واپس ملی۔ ایک پرائیویٹ سکول کے مالک مصطفیٰ سلیم کو خفیہ والے ۸ / اکتوبر ۱۹۹۴ء کو علی الصبح اس بنا پر ان کے گھر سے اٹھا کر لے گئے کہ وہ حکومت کی خواہش پر اپنے سکول میں لڑکیوں کے پردہ پر پابندی لگانے سے قاصر رہے۔ انہیں شدید جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ لوگ عدالتی احکامات کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ عدالت کسی شخص کو بے گناہی کے بدلے اگر رہائی کا حکم دیتی ہے تو اسی وقت اسے کسی دوسرے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اسی ماہ کے اواخر میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے موقعہ پر حکومتی کارروائیوں میں زبردست شدت آ گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکمران طبقہ مخالف جماعتوں کو اشتعال دلا کر کرش کرنے کا جواز پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اطلاع کے مطابق ۵۰ ہزار سے زائد افراد قیدی بنائے جا چکے ہیں جن میں زیادہ کا تعلق "الاخوان المسلمون" سے ہے تاکہ وہ انتخابات میں حصہ نہ لے سکیں۔ ان میں سے ۴۹ اخوانیوں کو فوجی عدالت کے ذریعے سزائیں بھی سنائی جا چکی ہیں۔ حکومتی جبر اور لاقانونیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کی اہم سیکولر جماعتوں کے سرکردہ نمائندے' جن میں "عرب ناصری پارٹی" کے ڈاکٹر حسام عیسیٰ اور مصری لیبر پارٹی کے سیکرٹری جنرل عادل حسین شامل ہیں اس صورتحال سے نالاں ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہیں۔

انسانی حقوق کی ان خلاف ورزیوں پر برطانیہ سے

وکلاء کا ایک گروپ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۵ء کو مصر پہنچا تو مصر کے اٹارنی جنرل نے اس سے ملاقات کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مقدمہ چونکہ فوجی عدالت میں ہے اس لئے وہ کچھ نہیں بتا سکتے۔ اس کے بعد وفد اپیلیٹ کورٹ کے نائب صدر' سعید ابد سے ملنے گئے تو وہاں سے بھی اوٹ پٹانگ جواب ملا۔ بعد ازاں وفد نے صدر کے نام خط دینا چاہا تو سرکاری اہلکار نے نہ صرف خط لینے سے بلکہ اپنے افسر اعلیٰ کا یہاں تک کہ اپنا نام بھی بتانے سے انکار کر دیا جس پر جان پلاٹس (بیرسٹر' سابق رکن پارلیمنٹ اور سابق مشیر سروسز چرچل) کو یہ کہنا پڑا کہ "تم بہت گھٹیا لوگ ہو!"

آخر میں وفد کو ہوٹل کی انتظامیہ کی طرف سے جگہ دینے سے انکار پر امیازا ہوٹل کے دروازے پر اپنی پریس کانفرنس کا اہتمام کرنا پڑا اور مسٹر پلاٹس نے اپنے کمرے میں صحافیوں کو آنے کی دعوت دی تو ایجنسیوں کے اہلکار سادہ کپڑوں میں وہاں بھی گھس آئے چنانچہ ایک اہلکار کو ایک امریکی اخبار کے نمائندے سے جو رائٹر کے ساتھ کام کرتا ہے سب کے سامنے تھپڑ کھانا پڑا۔

دیگر مسلمان ممالک کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ خصوصاً گزشتہ کئی سالوں سے الجزائر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ درحقیقت ہمارے مسلمان حکمران انتہائی بدعنوان' نااہل' ظالم اور ناعاقبت اندیش ثابت ہوئے ہیں جنہیں نہ اپنے عوام سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ اپنی آخرت کی پرواہ۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ روشن خیال یورپ اور امریکہ کی حکومتیں اپنے گھٹیا مفادات کے لئے ان کی پشت پناہ بنی ہوئی ہیں۔ مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی حکومتیں یہودیوں کی آلہ کار ہیں جبکہ یہودیوں کی اپنی تاریخ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے نبیوں اور رسولوں سے جو ان کے محسن اور سربراہ بھی تھے کبھی وفا نہ کی۔

اس کے باوجود کہ اس کے اصل ذمہ دار خود ہمارے حکمران اور ان کی سرپرست مغرب کی حکومتیں ہیں یہ امر اپنی جگہ بحث طلب اور متنازعہ فیہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ "دہشت گردی" اسلام کی رو سے جائز ہے یا نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی مضبوط مرکز نہ ہونے کی وجہ سے مختلف گروہوں میں بٹ کر نہایت ہی قیمتی جانیں قربان ہو رہی ہیں جن میں اکثریت نوجوانوں کی ہے جو کسی ملک اور قوم کے مستقبل کا سرمایہ ہوتے ہیں اور بہ ظاہر اس سے کوئی نتیجہ برآمد ہوتا بھی دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا ہر باشعور مسلمان کا یہ اولین فرض ہونا چاہئے کہ وہ اس ناگفتہ بہ

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

ملکی اثاثوں پر غیر ملکی قبضہ

کوٹ ادو پاور سٹیشن

نجکاری کے لئے سرفہرست کوٹ ادو پاور سٹیشن ہے جو گزشتہ دس سال میں بنایا گیا ہے۔ یہ پاکستان کا سب سے اچھا پاور سٹیشن ہے جہاں بجلی بنانے کا عمل بٹن دباتے ہی شروع ہو جاتا ہے جبکہ دوسرے تمام بجلی گھر پوری بجلی پیدا کرنے کے لئے دو سے تین گھنٹے لے لیتے ہیں۔ ۲۵۰ ایکڑ پر پھیلے ہوئے اس بجلی گھر سے ۱۳۰۰ میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے اور فی یونٹ خرچ صرف ساٹھ پیسے آتا ہے۔ یہاں ۸۰۰ ملازمین کام کرتے ہیں اور سالانہ سات ارب روپے منافع کماتے ہیں جو آئندہ سال بارہ ارب تک ہو جائے گا۔ اس پر اٹھنے والی کل لاگت ۶۶ ارب روپے ہے جس میں سٹاف کالونیوں کی تعمیر کا خرچ شامل نہیں ہے۔

کوٹ ادو کے آٹھ سو ملازمین کئی مہینوں سے اس کی نجکاری کے خلاف ہڑتال کر رہے تھے اور وہاں کسی غیر ملکی کو گھسنے کی جرات نہیں تھی۔ اتحاد کی برکت سے یہ عمل رکا رہا۔ پھر سودے بازی شروع ہوئی اور واپڈا کے کھاتے سے ان کی تنخواہوں میں ۳۵ فیصد اضافہ کر کے ان سے "ہاں" کرا لی گئی۔ اس کا سالانہ بل ۳۲-۳۰ لاکھ ڈالر ہو گا۔ آنے والے غیر ملکی "خریدار" ابھی سے یہ کہنے لگے ہیں کہ یہ بل حکومت پاکستان دے۔

سٹیٹ بینک اور نجکاری

مہران بینک کے گھپلے اور نادہندگان کی روز افزوں خبروں کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ بینکوں پر مزید پابندیاں لگا کر انہیں غلط لوگوں کو قرضے دینے سے باز رکھا جائے اور ان قرضداروں کے اثاثوں کو بیچ کر بینکوں کے نقصان پورے کئے جاتے۔ بدقسمتی سے آج ہی سٹیٹ بینک کی طرف سے بینکوں پر عائد پابندیاں نرم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اب تک بینکوں کے پاس جمع شدہ ڈیپازٹس کا صرف ۳۶ فیصد حصہ قرضوں کی صورت میں دیا جا سکتا تھا اور باقی رقم یعنی ۶۴ فیصد کا ۲۵ فیصد گورنمنٹ سیکورٹیز' ۵ فیصد سٹیٹ بینک کے پاس اور ۱.۵ فیصد خصوصی ریزرو فنڈ کی صورت میں رکھا جانا لازم تھا۔ نئے قوانین کے تحت اب بینک اوپر والی شرائط تو پوری کریں گے تاہم انہیں آزادی ہو گی کہ وہ ۳۶ فیصد کی بجائے اب ۶۴ فیصد تک قرض دے سکیں۔ ایسے بینک جن کے بارے میں ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے کہ انہوں نے اربوں کے قرضے ایسے لوگوں کو دے دیئے ہیں جن سے واپس ملنے کی کوئی توقع نہیں' مزید اختیارات کے ساتھ اس قوم کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ اگر ہم بینکوں کی نجکاری کو بھی ذہن میں رکھیں تو گمان ہوتا ہے کہ یہ کام بھی اپنوں سے زیادہ غیروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے۔ ایک بینک سے قرض دوسرے بینک کی خرید میں بڑا کام دے سکتا ہے۔ خدا معلوم کون کس کے لئے کام کر رہا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ قوم کو لوٹنے کے سبھی سامان تیار کر لئے گئے ہیں۔

آب پاشی نظام کی نجکاری

آئی ایم ایف کی ہدایات کے مطابق ملک کے آبپاشی نظام کی نجکاری ۱۹۹۶ء کے آغاز سے کرنے کی خبریں بھی آ رہی ہیں۔

(ماخوذ از "انصاف رپورٹ" ستمبر ۱۹۹۵ء)

امریکہ جاہلیت جدیدہ کا امام ہے

اسلام کے خلاف اس کی چالوں کو سمجھنا ضروری ہے

اقامت دین کے لئے وہی طریق کار کامیاب ہو گا جو سیرت سے قریب تر ہو گا

اصل اہمیت دین کی ہے شخصیات کی نہیں

عہد حاضر میں "خلافت" کا تذکرہ معدوم ہو چکا ہے' اسے موضوع گفتگو بنانا ضروری ہے

ڈاکٹر اسرار احمد نے جو منہج اختیار کیا ہے وہ سیرت سے مطابقت رکھتا ہے

ہماری تمام سعی و کوشش کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہئے

پہلی عالمی احیائے خلافت کانفرنس کے لئے امریکہ سے تشریف لانے والے ہمارے مسلمان مقرر ایفرو امریکن مسلمانوں کے معروف رہنما جناب امام جمیل الامین اور جناب امام عیسیٰ عبدالکریم سے "ندائے خلافت" کے پینل کی گفتگو

انٹرویو پینل : ڈاکٹر ابصار احمد' جناب سید نصیرالدین محمود اردو ترجمہ : ڈاکٹر احمد افضال

☆ : آپ دونوں حضرات نے تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع میں شرکت فرمائی' اجتماع سے متعلق آپ کے تاثرات کیا ہیں!

○ : سب سے پہلے تو ہم اس اجتماع میں شرکت کے لئے آپ کی دعوت اور یہاں لاہور میں آپ نے ہماری جو مہمان نوازی کی اس کے لئے آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جہاں تک اجتماع کا تعلق ہے' ہم نے یہاں جو کچھ دیکھا وہ بلاشبہ حوصلہ افزاء تھا۔ خصوصاً اس کام کے حوالے سے جو اسلام کے لئے ہونا چاہئے۔ میں نے خاص طور پر یہ بات نوٹ کی ہے کہ اجتماع میں جو مسلمان بھائی آئے تھے ان میں خاصی بڑی تعداد نوجوانوں کی تھی۔ یہ ایک ایسی عمر ہوتی ہے جب دین کے سوا بہت سی دوسری چیزیں بھی انہیں متوجہ کر سکتی ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے خلوص و اخلاص اور توجہ و انہماک کے ساتھ اس اجتماع میں شرکت کی اور یہاں دن رات گزارے' صرف اس مقصد کے لئے کہ دین کے احکام اور اس کی حکمت سیکھیں' خصوصاً اقامت دین کے حوالے سے' تو یہ شے بجائے خود تنظیم کی قیادت کے لئے قابل تعریف ہے کہ اس نے نظم کے معاملے میں کس طرح ارکان تنظیم کی تربیت کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی مقصد کے حصول کے لئے طریق کار اور خاص طور پر نظم کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ ہر شخص اتنا بڑا اجتماع منعقد نہیں کر سکتا' جس میں چار ہزار سے زیادہ لوگ شریک ہوں جن کی اکثریت پورا پورا دن تقاریر کو سنتے ہوئے اور اجتماع میں عملاً حصہ لیتے ہوئے گزار دے۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء کی طرف سے نظم کی پابندی کا مظاہرہ قابل داد ہے۔

☆ : امیر تنظیم اسلامی سے آپ حضرات کی ملاقات "ISNA" کنونشن کے دوران کولمبس (اوہایو) میں ہوئی تھی جہاں انہوں نے آپ کو بعض کیسٹ بھی دیئے۔ اس پورے فکر اور خصوصاً "منہج انقلاب نبوی" کے ضمن میں آپ کی کیا رائے ہے؟

○ : میں نے "پہلی عالمی خلافت کانفرنس" کے دوران اپنی تقریر میں بھی اسی بات پر زور دیا تھا اور اب پھر اسی کو دہرا رہا ہوں کہ نظام خلافت کے قیام کے لئے ایک خاص راستہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے' یہ راستہ نہایت دشوار گزار ہے۔ پھر یہ کہ یہ راستہ کوئی نیا یا نرالا راستہ نہیں ہے۔ آج سے پہلے بھی بہت سے افراد اس راستے پر سفر کرتے رہے ہیں۔ اس سفر میں کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ ہمارا طریقہ کار حضور ﷺ کے طریقے سے کس قدر قربت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے دوران ہمیں اسی نوعیت کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جس قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کا سامنا حضور

ﷺ کو کرنا پڑا تھا چونکہ حضورؐ کا طریقہ کار کامیابی سے ہمکنار ہوا' لہٰذا اگر آج ہم اپنی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنا چاہیں تو یہ حضورؐ کے طریقے کی پیروی کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ حضور ﷺ کے منہج سے جس قدر قریب ہو کر محنت کی جائے گی' اتنا ہی ہماری کامیابی کا امکان روشن ہو سکے گا۔

آج کے دور میں جب خلافت کا تذکرہ بھی معدوم ہو چکا ہے' اس کے قیام کی ضرورت کا احساس کرنا اور اسے بڑے پیمانے پر گفتگو کا موضوع بنانا اس

"یہ بات مسلم ہے کہ "خلافت" کے ادارے کے بغیر دارالسلام کا قیام ممکن نہیں' خلیفہ کے بغیر اسلام اپنی مکمل شکل میں ممکن نہیں اور نہ ہی اسلام کے بغیر خلیفہ کا کوئی تصور ممکن ہے"

بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر صاحب کو گہری نظر عطا کی ہے اور حالات کے درست تجزیے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ ورنہ یہ بات تو مسلم ہے کہ خلافت کے ادارے کے بغیر دارالسلام کا قیام ممکن نہیں' خلیفہ کے بغیر اسلام (اپنی مکمل شکل میں) ممکن نہیں' اور نہ ہی اسلام کے بغیر خلیفہ کا کوئی تصور ممکن ہے۔ ضروری ہے کہ اس قسم کے سوالات کو بحث کا موضوع بنایا جائے کہ اسلامی قیادت اصل میں ہے کیا' خلیفہ کسے کہتے ہیں' خلیفہ کا مطلب کیا ہے' حضور ﷺ نے اس سلسلے میں کیا احکامات دیئے ہیں' صحابہ نے اسے (یعنی اسلامی ریاست و خلافت کو) کس طرح عملی جامہ پہنایا؟ اس حوالے سے ایک زوردار انداز میں ان امور کو موضوع بحث بنانا ضروری ہے تاکہ امت مسلمہ میں اس کا شعور بیدار ہو۔ مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی شخص دو دماغوں کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا' خلیفہ کی حیثیت بھی امت کے جسد میں دماغ کی سی ہے۔ (لہٰذا امت کا ایک ہی خلیفہ ہونا چاہیے)۔ چنانچہ جب ہم اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے واقعی سنجیدہ ہو جائیں گے تو ہماری سنجیدگی اور اخلاص کا اظہار اس بات سے ہوگا کہ ہماری (توجہات کا ارتکاز) اور ہماری گفتگوؤں کا موضوع یہ بات بن جائے کہ خلافت کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔ پھر ان بحثوں سے آگے بڑھ کر' اگر اللہ توفیق دے تو ہم گہرائی میں اتر کر حضور ﷺ کی سیرت کا اور صحابہؓ کے عمل کا جائزہ لیں کہ انہوں نے قیادت اور اختیار و اقتدار کو کس طرح استعمال کیا۔ اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ صحیح اسلامی قیادت کیا ہوتی ہے؟۔

☆ : جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نظام خلافت کے قیام کے لئے جو منہج پیش کیا ہے' اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟۔

○ : یہ منہج حضور ﷺ کی سیرت سے مطابقت رکھتا ہے' اور اصل اہمیت اسی چیز کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حضورؐ کی سیرت کو مثال اور نمونہ تسلیم کر کے اسی کو اپنا راہ نما بنایا ہے۔ وہ خود بھی اس بات کا اعلان و اعتراف کرتے ہیں اور اسی طرح ہم بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ حضور ﷺ کی سیرت کو اصل نمونہ بنایا جانا چاہیئے۔ پھر اگر آپ کی منزل بھی وہی ہو جو ہماری ہے' اور آپ بھی سفر کے لئے اسی نقشے کو استعمال کر رہے ہوں جس نقشے کو ہم استعمال کر رہے ہیں تو لامحالہ کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی موڑ پر' ہماری آپ سے ملاقات ہو کر رہے گی' خواہ وہ لاہور میں ہو یا نیویارک میں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لائے اور ہمارے دلوں کو باہم جوڑ دے۔ اگر ہمارے پاس پوری دنیا کی دولت بھی ہو تب بھی ہم لوگوں کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے کہ وہ ہی اصل میں دلوں کو جوڑنے والا ہے۔ اللہ کرے کہ ہم اپنے اندر اس بات کا بھی شعور پیدا کر سکیں کہ ہمارے علاوہ بھی بے شمار افراد ایسے ہیں جو اسی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں کہ دارالسلام کا قیام عمل میں لایا جا سکے' اور یہ مقام شکر ہے۔

☆ : آپ کی تنظیم بھی بیعت کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس نوعیت کی بیعت ہے۔ اس بیعت کے الفاظ کیا ہے؟

○ : سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے معروف معنوں میں کوئی ادارہ یا تنظیم قائم نہیں کی ہے بلکہ ہم اصل میں ایک "Community" ہیں' اور حضور ﷺ نے امت کے لئے جو اصول و ضوابط مقرر فرمائے ہیں انہی کا ہم نے اپنے اوپر بھی اطلاق کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بعض چیزیں اپنے وجود کے اعتبار سے بجائے خود اہمیت کی حامل ہوتی ہیں' انہی میں بیعت کا نظام بھی شامل ہے۔ حضور ﷺ نے امت کا جو نظام تشکیل دیا اس میں ایک شخص کی زبان سے نکلنے والے الفاظ نہایت اہم ہوتے ہیں۔ الفاظ ہی کی بنیاد پر طے کیا جاتا ہے کہ کون امت میں شامل ہے اور کون امت سے باہر ہے۔ زبانی دعوے یا عہد کی یہ اہمیت اس لئے ہے کہ اگر ایک شخص زبان سے کوئی بات کہتا ہے تو پھر آپ کو خود بخود اس کا حق مل جاتا ہے کہ آپ اس سے سوال کریں کہ اس کا عمل اس دعوے کے مطابق ہے یا نہیں۔ پھر یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ ہر بڑے کام میں شریک ہونے کے لئے کسی نہ کسی قسم کا حلف اٹھانا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب امریکی شہری اپنا قومی ترانہ پڑھتے ہیں اور اپنے پرچم کے ساتھ وفاداری کا عہد دہراتے ہیں تو یہ بھی ایک قسم کی بیعت ہی ہے۔ اسی طرح جب ایک ڈاکٹر تعلیم مکمل کر کے باقاعدہ طور اپنے پیشے میں قدم رکھتا ہے تو اسے ایک حلف اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ معاملہ پولیس یا مسلح افواج کا بھی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان زبان سے جو وعدہ کرتا ہے اور پھر جس قسم کے اعمال اس سے صادر ہوتے ہیں' ان دونوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ جب آپ زبان سے کوئی وعدہ کر لیتے ہیں تو پھر اس کے مطابق عمل کرنا بھی آپ پر لازم ہو جاتا ہے۔

جدوجہد یا محنت کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ جسے قرآن "کبد" کہتا ہے۔ یعنی ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے اسے ہمہ وقت اپنی معاش اور بقاء کے لئے کوشش کرنا پڑتی ہے' دوسری قسم کی جدوجہد وہ ہے جسے قرآن "جہاد فی سبیل اللہ کہتا ہے' یعنی شعور کے ساتھ اللہ کے راستے میں کوشش کرنا۔ بیعت کی اصل

"اسلام کو قائم کرنے کے ضمن میں ہمارے اوپر ایک غیر معمولی ذمہ داری عائد ہوتی ہے' ہمیں اس ذمہ داری کا اور اپنے مقام کا پورا پورا ادراک ہے"

حیثیت یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد کردہ فرائض کو ادا کرنے کے لئے شعوری طور پر ارادہ کر کے انسان کمربستہ ہو جائے۔ اس ارادے کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔

بیعت کے لئے ہم وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو صحیح بخاری میں وارد ہوئے ہیں جب صحابہ نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ "ہم سنیں گے اور مانیں گے' خواہ آسانی ہو یا مشکل' ہم صاحب امر سے جھگڑیں گے نہیں' سچ بولیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے"۔

ہمیں خوب علم ہے کہ ہم جس کام کے لئے بیعت لیتے ہیں اس سے بلند تر درجے میں بھی ایک

بیعت ہے' یعنی بیعت جہاد! لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری بیعت اس اعتبار سے ضروری ہے کہ پہلے لوگ اس بیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے عادی ہو جائیں۔ پھر جب اس سے اونچے معیار پر کام کرنے کا موقع آئے گا تو وہ پہلے سے تیار ہوں گے۔

☆ : آپ کی تنظیم کس طرح کام کرتی ہے؟

○ : جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ ہم نے معروف معنوں میں کوئی تنظیم قائم نہیں کی بلکہ ہم کمیونٹی کے طور پر کام کرتے ہیں جس شے کو معروف معنوں میں تنظیم کہتے ہیں اس میں طے شدہ قواعد و ضوابط کے تحت کام کیا جاتا ہے' لیکن ہم اسی انداز میں محنت کر رہے ہیں جس طرح حضور اکرم ﷺ نے ایک امت قائم کی تھی اور اس امت پر قرآن و سنت کے احکامات کی پابندی کو لازم کیا تھا۔ ضروری ہے کہ ہم اسی امت کو نمونہ تسلیم کریں اور بالکل اسی انداز میں مسلمانوں کے معاشرے تشکیل دیں۔

حضور اکرم ﷺ کا مقصد کوئی جماعت یا تنظیم بنانا نہیں تھا' بلکہ آپؐ کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا تھا۔ لیکن عبادت کا ظہور جس شکل میں ہوا اس شکل پر نظم یا جماعت کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ اذان کے ذریعے لوگوں کو نماز کی طرف بلایا جاتا ہے' کسی تنظیم کے قیام کے لئے دعوت نہیں دی جاتی' لیکن جب لوگ جمع ہوتے ہیں اور نماز کھڑی ہوتی ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ خود بخود ایک قسم کا نظم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اذان کہنے سے کوئی جماعت سازی مقصود نہیں تھی۔

ہم نے اپنے لئے کوئی مخصوص نام بھی اسی وجہ سے اختیار نہیں کیا کہ ہم اپنے آپ کو اسی کوشش کا جزو سمجھتے ہیں جس کا آغاز حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا۔ ہم حضورؐ کی قائم کردہ امت کا تسلسل ہیں۔ اس پورے سلسلے میں کہیں کوئی رخنہ نہیں آیا۔ حضورؐ کا قول ہے کہ میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو گی۔ یعنی امت مسلمہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ضرور رہیں گے جنہیں دین کا صحیح فہم بھی حاصل ہو گا اور اس پر عمل کی توفیق بھی حاصل ہو گی۔ حضورؐ نے اپنی جدوجہد کا یا اپنی امت کا کوئی نام نہیں رکھا' اور ہم بھی اسی کام کا حصہ ہیں۔

☆ : آپ لوگ کس نوعیت کی کوششوں میں مشغول ہیں؟

○ : ہمارا کام "اقامت صلوٰۃ" کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے۔ جب بھی کسی علاقے یا محلے کے لوگ بیعت کر کے ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں تو ہم ان کی اس سلسلے میں پوری مدد کرتے ہیں کہ وہ نماز کو قائم کریں اور اس کے نظام کو مستقلاً برقرار رکھیں۔ اقامت صلوٰۃ کو جز اور بنیاد قرار دینے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے اس گروہ میں معاشرتی اور تعلیمی کام بھی اسی حوالے سے منظم ہونے لگتے ہیں۔ جب ان لوگوں کا ایک مرکز وجود میں آ جاتا ہے جو نماز کے نظام کو باقاعدہ طور پر اختیار کر چکے ہوتے ہیں تو پھر وہ خود بخود ایک دوسرے کے سماجی معاملات میں بھی حصہ لینا شروع کر دیتے ہیں' جیسے مدرسے' شادی بیاہ' رمضان' اور زکوٰۃ وغیرہ۔ یہ تمام معاملات خود بخود آگے بڑھتے ہیں لیکن ہمارا کردار صرف نماز کے قیام میں مدد دینے تک محدود رہتا ہے۔

☆ : ہمارے خیال میں عبادت کا لفظ نہایت وسیع معنوں کا حامل ہے اور اس میں تمام شعبہ ہائے حیات شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے تصور کے مطابق سیاسی اور معاشی نظام بھی عبادت کا اتنا ہی اہم حصہ ہیں جس قدر نماز اور روزہ۔ اس کے برعکس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا تصور عبادت صرف مسجد تک محدود ہے؟

○ امام جمیل الامین : ہم آپ سے بالکل متفق ہیں کہ ہر نیک عمل دراصل عبادت ہوتا ہے جب لوگ نماز کے لئے جمع ہوتے ہیں تو ان میں مل جل کر برائی کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی پیدا ہو جاتی ہے' لیکن بنیادی حکم یہی ہے کہ نماز قائم کرو۔

عیسیٰ عبدالکریم : ہم سمجھتے ہیں کہ اصل اہمیت عمل کی ہوتی ہے نہ کہ شخصیات کی۔ عمل کا تسلسل ہی اصل شے ہے ورنہ افراد تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہم یہ تو کہتے ہیں کہ ہم اسلام پر عمل کے معاملے میں مخلص اور سنجیدہ ہیں لیکن ہم یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرتے کہ ہمارے علاوہ کوئی بھی اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہم مانتے ہیں کہ ہمارے علاوہ بھی دنیا میں بہت سی اسلامی تحریکیں مصروف عمل ہیں' جن میں ایسی بھی ہیں جنہیں عام طور پر لوگ نہیں جانتے۔ یہ سب وہی کام کر رہی ہیں جو ہم کر رہے ہیں' اور حضورؐ کا نمونہ اور اسوہ ان کے پیش نظر بھی ہے۔ ہم اسی وسیع تر تحریک کا جزو ہیں اور اسی لئے ہم نے اپنے لئے کوئی مخصوص نام بھی اختیار نہیں کیا۔ کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے گویا ہم اپنے آپ کو باقی امت سے کاٹ لیں گے' اور ہمارے اندر یہ خوش فہمی پیدا ہو جائے گی کہ شائد ہم ہی ہم ہیں۔ اسی متکبرانہ طرز فکر سے بچنے کے لئے ہم نے اپنے لئے کوئی علیحدہ نام اختیار نہیں کیا۔

☆ : آپ کے خیال میں امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل کیسا ہے؟ نیز اسلامی دعوت کے کام کے سلسلے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

○ : کفر اور مغرب کی جاہلیت کا مرکز اس وقت امریکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسے ماحول میں پیدا فرمایا ہے جہاں ہمیں اس پورے کافرانہ نظام کو گہری نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع حاصل ہے۔ ہمیں ان لوگوں کے کردار کو سمجھنے کا موقع بھی ملا ہوا ہے جو کفر کے نمائندے ہیں اور کفر کے نظام کے ساتھ جن کے مفادات وابستہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ اس ملک میں اسلام کو ترقی دے رہا ہے اور ہمارے اندر سے مسلمانوں کو اس کام کے لئے اٹھا رہا ہے۔ اسلام اس تیز رفتاری سے ترقی پا رہا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰۰ء تک امریکہ میں دوسرا بڑا مذہب اسلام ہو گا۔ درحقیقت اسلام ہی تمام مسائل کا اصل حل ہے' لہٰذا وہ لوگ جو اس سے محروم ہیں اور دوسرے راستوں سے غیر مطمئن ہو کر کسی نعم البدل کی تلاش میں ہیں' وہ اسلام کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

اسلام کو قائم کرنے کے ضمن میں ہمارے اوپر ایک غیر معمولی ذمہ داری عائد ہوتی ہے' ہمیں اس ذمہ داری کا اور اپنے مقام کا پورا پورا ادراک ہے۔ جیسے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سورج جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے' ایک وقت آئے گا کہ وہ مغرب سے ابھرے گا۔ اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ اس دور

"ہم یہ تو کہتے ہیں کہ ہم اسلام پر عمل کے معاملے میں مخلص اور سنجیدہ ہیں لیکن ہم یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرتے کہ ہمارے علاوہ کوئی بھی اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے' اس کے برعکس ہم مانتے ہیں کہ ہمارے علاوہ بھی دنیا میں بہت سی تحریکیں مصروف عمل ہیں"

میں اسلام کی روشنی مغرب سے اور امریکہ سے ابھر رہی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے اوپر جو خصوصی ذمہ داری ہے' ہمیں اس کا پورا احساس ہے اور ہم اپنے کام کو کسی بھی طرح غیر اہم یا معمولی نہیں سمجھتے۔

☆ : جناب عیسیٰ عبدالکریم صاحب! کیا امریکہ میں اسلام کے مستقبل کے متعلق آپ بھی پر امید ہیں؟

○ عیسیٰ عبدالکریم : کسی بھی جنگ میں سب سے اہم کردار وہ لوگ ادا کرتے ہیں جو سب سے اگلے محاذ پر لڑ رہے ہوں۔ کفر اور اسلام کی جنگ میں سب سے اگلا محاذ امریکہ ہے' یعنی یہ موجودہ کفر اور جاہلیت جدیدہ کا اصل مرکز ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قسم کی جاہلیت سب سے پہلے امریکہ میں جنم لیتی ہے اور پھر پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ جو کچھ امریکہ میں ہوتا ہے اس کا اثر یہاں پاکستان میں بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلام اور کفر کے معرکہ میں اصل فیصلہ کن محاذ مغرب کی سرزمین ہے۔

جمیل الامین : صرف انسان ہی اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہے جس میں ایمان کو حاصل کرنے کی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ ایمان کے بغیر انسان محض ایک جانور بن کر رہ جاتا ہے۔ اللہ کی نظر میں سب سے برے حیوان وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں رکھتے۔ ہمیں اس حیوانیت سے براہ راست واسطہ پڑ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اس حیوانیت کا مشاہدہ کرنے کا موقع دیا ہے' وہیں ہمیں اس شر کو برداشت کرنے اور جھیلنے کی طاقت بھی عطا فرمائی ہے۔ اس میں یقیناً اللہ کی حکمت ہے کہ اس نے ہمیں ایسے ماحول میں پیدا کیا جہاں ہم اس جدید مغربی تہذیب کی حیوانیت کو براہ راست سمجھ کر دوسروں کو اس کے خطرات سے آگاہ کر سکتے ہیں۔

☆ : آپ کے خیال میں مسلمانوں کو عالمی سطح پر جن چیلنجوں کا سامنا ہے' ان سے عہدہ برا ہونے کا صحیح طریقہ کار کیا ہو گا؟

○ : سب سے پہلے ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ ہمارا دشمن ہمارے خلاف کیا چالیں چل رہا ہے۔ کفار کا آج کے دور میں کیا طرز عمل ہے؟ اسی تجزیے کی روشنی میں ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ اپنے لئے صحیح لائحہ عمل کا انتخاب کر سکیں۔

دفاع کا ایک پرانا اور آزمودہ نکتہ یہ ہے کہ ہر سمت میں اور ہر محاذ پر دفاع کیا جائے تاکہ دشمن کو حملہ کرنے کے لئے کوئی رخنہ نہ مل سکے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں یہی اصول بروئے کار لا کر "European Union" کی تاسیس ہو رہی ہے۔ امریکہ کے سابق صدر آئزن ہاور نے ۱۹۵۲ء میں "ریاست ہائے متحدہ یورپ" کی بات کی تھی اور یہی تصور ہے جس نے ۱۹۹۲ء میں باقاعدہ چارٹر کی شکل اختیار کی۔ یہی لوگ اب ایک نئے عالمی نظام کے تحت حاکم بننا چاہتے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ تصور قدیم یونانیوں اور رومیوں سے چلا آ رہا ہے کہ ایک ہی مرکزی عالمی حکومت قائم کی جائے' جس کو وہ خود کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ اسی کی علامت ہے کہ امریکی ایف بی آئی کے ایجنٹ پاکستان آ کر یہاں گرفتاریاں کر لیتے ہیں اور اسی لئے یہ کہا جا رہا ہے کہ کسی ملک کے خلاف فوجی اقدام سب کو مل کر مشترکہ طور پر کرنا چاہئے۔ اسی لئے یہ ضروری ہوا کہ مشرقی اور مغربی برلن کے درمیان کھڑی دیوار کو گرایا جاتا' کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک منقسم جرمنی کے ساتھ ایک متحدہ یورپ کا قیام ممکن نہ تھا۔

> **"اللہ کرے کہ ہم اپنے اندر اس بات کا بھی تصور پیدا کر سکیں کہ ہمارے علاوہ بھی بے شمار افراد ایسے ہیں جو اس جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں کہ دار السلام کا قیام عمل میں لایا جا سکے' اور یہ مقام شکر ہے"**

دیوار برلن کا گرایا جانا دراصل یورپی ممالک کے درمیان طے پانے والے منصوبے کے تحت ہوا' یہ کوئی فوری اور اضطراری قسم کا حادثہ یا ردعمل نہ تھا' جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کی کشمکش اس وقت امریکہ میں جاری ہے۔ ایک جانب دائیں بازو کی مسلح جماعتیں "Militias" ہیں اور دوسری طرف وہ سیاست دان اور مقتدر طبقہ ہے جسے "Intemationalists" کہا جاتا ہے اور جو عالمی غلبے کے خواب دیکھتا ہے۔

ہمارے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ ان بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھیں اور بغور جائزہ لیتے رہیں کہ یہ لوگ کیا کر رہے۔ اسی تجزیے سے ہم اپنے لئے درست حکمت عملی اختیار کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے' ہمیں خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہر قسم کے حالات میں ایک ہی حکمت عملی کام نہیں دے سکتی بلکہ حالات کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے لائحہ عمل کو بھی اس کے مطابق بدلتے رہنا چاہئے۔

نظم کی بہت اہمیت ہے۔ اس کی ابتداء اپنے نفس کو قابو کرنے سے ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ طاقتور وہ نہیں جو بہت بڑا پہلوان ہو بلکہ طاقتور اصل میں وہ ہے جو اپنے غصے پر قابو پا سکے۔ اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں روزے کی عبادت عطا فرمائی ہے تاکہ ہم ضبط نفس کے عادی بن سکیں۔ یہ تمام تربیت اس لئے ہے کہ مسلمان پوری دنیا کے لوگوں کے مقابلے میں سب سے بہتر کردار کے حامل بن جائیں۔ پھر جب (حق و باطل کے درمیان) کسی تصادم کا موقع آئے تو یہی چیز اہم ہو گی کہ ہم اپنی بنیادوں کے ساتھ مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں یا نہیں۔

عیسیٰ عبدالکریم : حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں ہم اللہ تعالیٰ کی خصوصی حکمت کا ظہور دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنے پیغمبر کو فرعون کے محل میں پروان چڑھنے کا موقع دیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اندر دشمن کی چالوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام نے بچپن اور جوانی اپنی قوم کے درمیان گزاری ہوتی تو ان میں وہ سیاسی اور جنگی بصیرت پیدا نہ ہو سکتی تھی جو بعد میں آل فرعون کے مقابلے میں آپؑ کے کام آئی۔ آج کل کے دور میں جو اسلامی تحریکیں چل رہی ہیں' ان میں اسی شے کی کمی ہے۔ یہ لوگ عموماً دین و شریعت کا علم تو خوب رکھتے ہیں لیکن ان میں دشمن کی ذہنیت اور چالوں کو سمجھنے کی صلاحیت بالعموم مفقود ہے' انہیں حکمت عملی کے معاملے میں مہارت حاصل نہیں۔

☆ : امریکہ میں اسلام کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کی کیا صورت حال ہے' نیز ان تنظیموں کے ساتھ آپ کا تعاون کس نوعیت کا ہے؟

○ : امریکہ اور کینیڈا کے مسلمانوں نے ایک مجلس مشاورت تشکیل دی ہے جسے "Shoora of North America" کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں چار بڑی تنظیمیں اور "Communities" شامل ہیں' جن میں Society of North America) "ISNA" of North America) ICNA '(Islamic (Islamic Circle)' امام وارث دین محمد کی کمیونٹی اور وہ کمیونٹی جس کا امام میں خود ہوں۔ اس مجلس مشاورت کی بنیاد قرآن حکیم کے اس حکم پر ہے جس میں باہم مشورہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں میں شوریٰ کی اہمیت کا احساس اجاگر کیا جائے اور انہیں ایک دوسرے کے

قریب لایا جائے۔ تاکہ وہ اپنے معاملات میں مل جل کر خود فیصلے کر سکیں۔ یہ واضح رہے کہ شوریٰ ابھی بڑی حد تک نامکمل ہے۔ امریکی مسلمانوں کی کئی تنظیمیں اور گروہ ایسے ہیں جن کی شوریٰ میں نمائندگی نہیں ہے۔ دراصل یہ سارا نظام ابھی اپنے ابتدائی مرحلے میں ہے۔

☆ : اس مجلس مشاورت کے پس منظر پر روشنی ڈالیے کہ اس کا آغاز کس طرح ہوا؟۔

○ : چند سال پہلے ہم سب لوگ بوسنیا کے مسئلے پر اقوام متحدہ میں احتجاج کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ دراصل "ICNA" نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ ہمیں "Bosnian Task Force" بنانی چاہئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے ہمارا ایک اجتماع کیلیفورنیا میں منعقد ہوا تھا اور اسی اجتماع میں سب سے پہلے شوریٰ کا خیال پیدا ہوا۔ ہم نے طے کیا کہ ایسا ادارہ قائم ہونا چاہئے تاکہ اہم معاملات میں امریکی مسلمانوں کی رہنمائی کی جا سکے اور وحدت کی کوئی شکل سامنے آ سکے۔ شوریٰ کے پہلے کنوینر جناب عبداللہ ادریس ہیں جو "ISNA" کے صدر ہیں۔ ان کی میعاد اس سال ختم ہو گی تو میں شوریٰ کا دوسرا کنوینر بنوں گا۔ میری ذمہ داری یہ ہو گی کہ قومی سطح پر حج کے انتظامات کئے جائیں اور امریکی مسلمانوں کو حج کے سفر کے لئے مختلف جماعتوں کی شکل میں منظم کیا جائے۔ ہمارا مقصد یہ بھی ہے کہ حاجیوں کے سفر حج کے سلسلے میں جس لمبی چوڑی دفتری کاروائی سے واسطہ پڑتا ہے اسے آسان بنایا جا سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو صرف مذہب کی بنیاد پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ انہیں کسی دوسری بنیاد پر جمع کرنا چاہیں تو اتحاد کے بجائے افتراق پیدا ہو گا۔ حضور ﷺ کا قول بھی ہے کہ کسی سے صحیح معنوں میں واقفیت پیدا کرنے کے لئے اس کے ساتھ سفر کرنا ضروری ہے۔ ساتھ کھاؤ اور ساتھ آرام کرو۔ چنانچہ سفر حج سے یہ مقصد حاصل کرنا بھی مقصود ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں حرکت اور جذبہ پیدا ہو۔ ہر سال نو دس ہزار مسلمان امریکہ سے حج کے لئے جاتے ہیں۔ اگر ہم باقاعدہ انتظامات کر کے پچاس ساٹھ ہزار افراد کو حرکت میں لے آئیں تو مقامی غیر مسلم آبادی پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو بھی اس کا احساس ہو جائے گا کہ اگر پوری امت کے لئے شوریٰ بنانے کا معاملہ پیش آتا ہے تو اس میں لازماً شمالی امریکہ کے مسلمانوں کو بھی شامل کرنا پڑے گا۔

☆ : آپ کے خیال میں دور حاضر میں مسلمانوں کو کس قسم کے مسائل کا سامنا ہے؟ اور ان کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟

○ عیسیٰ عبدالکریم : اصل بات یہ ہے کہ ہمارا زور عمل پر ہونا چاہئے' شخصیات پر نہیں۔ اگر کوئی شخص حق بات کہہ رہا ہے تو یہ سچائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شخص کا ذاتی ہنر نہیں ہے۔ آپ کو وہ واقعہ یاد ہو گا جب حضور ﷺ کی وفات کے موقع حضرت ابوبکرؓ نے امت کو یاد دلایا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو چکا ہے لیکن امت موجود ہے اور اس کے فرائض باقی ہیں۔ اس کے برعکس آج مسلمانوں میں سارا زور شخصیتوں پر ہو چکا ہے۔ جب مسلمان ذہنی طور پر پختگی کو پہنچیں گے تبھی ان میں یہ شعور پیدا ہو گا کہ اصل اہمیت اللہ کی کتاب اور اس

> "آپ لوگوں کی منزل بھی وہی ہے جو ہماری اور آپ بھی سفر کیلئے اس نقشے کو استعمال کر رہے ہوں جس نقشے کو ہم استعمال کر رہے ہیں تو لامحالہ کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی موڑ پر' ہماری آپ سے ملاقات ہو کر رہے گی"

کے رسولؐ کی سنت کو حاصل ہے' شخصیات قطعی غیر اہم ہیں اور یہ کہ ہم سب ایک ہی امت کے جزو ہیں۔

☆ : تنظیم اسلامی کے رفقاء کے لئے آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

○ : یہ پوری امت ایک ہی برادری پر مشتمل ہے۔ حضور ﷺ نے جو احکامات ہمیں دیئے ہیں وہ آج بھی پوری طرح قابل عمل ہیں۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ تم چاہتے ہو کہ آپس میں محبت بڑھے تو سلام کو رواج دو۔ یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں میں باہمی تعلقات مضبوط ہوں اور ہم جغرافیہ' نسل اور قومیت سے بلند ہو کر ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب ہم ایک دوسرے کو اسلام کے حوالے سے دیکھیں اور پہچانیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو کوشش یہاں شروع کی گئی ہے وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو۔

☆ : اسلام پر عمل کرنے کے سلسلے میں ہم کس کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں؟ خصوصاً اس حوالے سے کہ تنظیم اسلامی کی جدوجہد صرف نماز اور روزے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہم پورے نظام کو اسلام کا تابع کرنا چاہتے ہیں۔

○ : اگر آپ اپنی جگہ بھرپور انداز میں کام کریں گے تو یہ ہمارے لئے تقویت کا باعث بنے گا۔ اسی طرح ہم اپنے ماحول میں جتنی محنت کریں گے وہ آپ کو قوت پہنچانے کا سبب بنے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا اور آپ کا نصب العین ایک ہی ہے' یعنی جاہلیت کی تمام شکلوں کو منظم انداز میں ختم کرنا۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اس نے یہ دین اس لئے بھیجا ہے کہ یہ "کل نظام زندگی پر" غالب ہو کر رہے' اس لئے نہیں کہ یہ مغلوب ہو کر رہے اور نہ اس لئے کہ یہ جاہلیت کو برداشت کرے۔ بلکہ یہ دین اسی لئے آیا ہے کہ یہ غلبہ حاصل کرے اور تمام دوسرے طریقوں پر غالب ہو کر رہے۔ ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہی ہے' یعنی دین کو قائم کرنا۔ اگر آپ اس کوشش کو یہاں آگے بڑھائیں اور ہم یہی کوشش وہاں کریں تو ان شاء اللہ یہ کام متوازی انداز میں ترقی کرے گا۔ ہمیں آپ کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو آپ بھی ہماری اہمیت کو سمجھ لیں گے۔ ہم ایک دوسرے سے کٹ کر یا الگ تھلگ ہو کر کام نہیں کریں گے۔ اس کے برعکس ہماری نیت تو یہ ہے کہ ہم ان تمام بھائیوں اور ان تمام جماعتوں کے ساتھ مل جل کر کام کریں جو خلوص کے ساتھ عبادت کے قیام کے لئے کوشاں ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ عبادت کا تعلق پورے نظام کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب آپ کہتے ہیں کہ نظام جاہلی کو ہٹا کر نظام اسلامی کو لانا ہے تو ہم اس میں پوری طرح متفق ہیں۔ یہ خیال سرے سے غلط ہے کہ عبادت محض مسجد تک محدود کوئی شے ہے۔ حضورؐ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ تم کوئی منکر دیکھو تو اسے ہاتھ سے بدل دو' اگر یہ نہیں کر سکتے تو اس کے خلاف آواز بلند کرو اور اگر تم یہ بھی نہیں کر سکتے تو دل میں اس منکر کے خلاف نفرت رکھو' اور یہ ایمان کی کمزور ترین شکل ہے۔

عیسیٰ عبدالکریم : اسلامی قیادت دنیا میں کہیں سے بھی ابھر سکتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اسلام کی روشنی کس سرزمین سے برآمد ہو گی۔ مفروضوں پر نہیں چلنا چاہیے بلکہ ہمارا اصل کام یہ ہونا چاہئے کہ ہم فرائض پر کاربند رہیں یہ سعادت جس کے حصے میں بھی آئے' بہرحال ہم سب ایک ہی امت کے افراد ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

جناب منور حسن کی تشخیص درست نہیں ہے!!

داعیان دین کے قول و فعل کے تضاد نے لوگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے

دینی سیاسی جماعتوں نے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کئے جو سیکولر جماعتیں کرتی ہیں

کراچی سے ہمارے مستقل قلمی معاون جناب محمد سمیع کا ایڈیٹر "جسارت" کے نام خط جو وہاں شرمندۂ اشاعت نہ ہو سکا

محترم مدیر روزنامہ "جسارت" کراچی

السلام علیکم، مزاج گرامی!

آپ کے روزنامہ کا شذرہ بعنوان "منور حسن کی درست تشخیص" جو ۶ نومبر کو شائع ہوا کئی اعتبارات سے محل نظر ہے۔

جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل سید منور حسن نے راولپنڈی پریس کلب میں درس قرآن کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک میں محض دعوت و تبلیغ سے کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ حالات میں تبدیلی کے لئے عملی جدوجہد بھی ضروری ہے۔ اس سے قطع نظر کہ دعوت و تبلیغ کے لئے بھی عملی جدوجہد ناگزیر ہے، انکی اس بات سے راقم کو بھی اتفاق ہے۔ ان کا یہ فرمانا کہ ناخواندہ افراد قول کی بجائے فعل کی زبان بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ یہاں اس وضاحت کی ضرورت ہے کہ "فعل" سے ان کی مراد کیا ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ دین زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے لہٰذا لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جو لوگ تبلیغ دین میں مصروف ہیں، اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں اپنی تبلیغ کے عملی نمونہ بن کر دکھائیں۔ لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ "فعل" سے سید صاحب کا مطلب سیاسی عمل ہے اور اگر یہ درست ہے تو میں انتہائی ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ سیاست کی حد تک دینی عناصر کے قول و فعل میں تضاد کی بنا پر لوگوں کا ان پر اعتماد کم ہوا ہے۔ اس کا واضح ثبوت ۹۳ء کے عام انتخابات کے نتائج ہیں۔ مذہبی سیاسی عناصر خصوصاً خود "سید" صاحب کی اپنی جماعت نے جس "فعل" کا مظاہرہ کیا ہے اس پر لوگوں نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔

اب آیئے اس دوسرے مسئلہ کی طرف جس کی نشان دہی سید صاحب نے کی ہے۔ ان کی اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ افراد کو درپیش مسائل کی نوعیت ایسی ہے کہ انہیں صرف دعوت و تبلیغ کے ذریعہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کس بات کی ہو رہی ہے؟ اگر دعوت و تبلیغ مکمل دین کی ہو رہی ہے تو ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے دین میں ہمارے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ اب اگر یہ بات درست ہے اور دعوت و تبلیغ بھی مکمل دین کی ہو رہی ہے پھر بھی لوگوں کے مسائل حل نہیں ہو رہے ہیں تو ہمیں سوچنا چاہئے کہ کیا ہمارا یہ خیال بلکہ زعم درست ہے کہ دعوت و تبلیغ مکمل دین کی ہو رہی ہے۔ دعوت و تبلیغ دین کے نتائج تو یہ بتا رہے ہیں کہ دعوت، دین کی بجائے کسی اور شے کی ہو رہی ہے۔ وگرنہ اسی دین کی دعوت تھی جس میں نبی اکرم ﷺ کو اس دور جاہلیت کے کسی مسئلہ کے بارے میں سوچنا نہ پڑا اور نہ ہی انہوں نے ان مسائل کے حل کو اپنا ہدف بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی دین کی دعوت و اقامت کے نتیجہ میں وہ عادلانہ نظام غالب ہوا جس نے اس دور کے لوگوں کے تمام مسائل حل کئے۔ دراصل آج ہمارا ہدف بدل چکا ہے۔

> **"انہیں سیاسی سرگرمیوں سے فرصت ہی نہیں ہے کہ وہ لوگوں تک دین کے جامع تصور کو پہنچا سکیں۔ اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ خود ان جماعتوں کے وابستگان کی ذاتی زندگیوں میں بھی دین کا عمل دخل واجبی سا رہ گیا ہے"**

نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا انداز یہ تھا کہ پہلے لوگوں کو مسبب الاسباب ہستی کی طرف بلایا جاتا اور ان کے ذہن میں یہ بات راسخ کی جاتی تھی کہ توکل اسباب کی بجائے مسبب الاسباب؟؟ پر ہونا چاہئے۔ وہ چاہے تو انتہائی نامساعد حالات میں بھی ان کی مشکل کشائی کر سکتا ہے۔ لیکن آج کے داعی کا ہدف "مسائل کا حل" ہو کر رہ گیا ہے۔ مسائل کے حل کے لئے داعی جماعتیں وسائل کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ وسائل فراہم کرنے والا تو انسانی ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں ہو تو ہو، سامنے نظر نہیں آتا!! اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ہم نے اسلامی انقلاب کے لئے انتخابی راستے کو اختیار کیا ہے۔ انتخابات میں کامیابی لوگوں کے ووٹوں کے ذریعہ ممکن ہے اور اگر ان کے مسائل ہم حل نہ کر سکے تو لوگ ہمیں ووٹ نہیں دیں گے۔ حالانکہ راقم اس سارے تجزیہ کو ہی سرے سے غلط سمجھتا ہے۔ لوگ "صالحین" کو ووٹ اس لئے نہیں دیتے کہ ان کا ذہن سیکولر ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انتخابی سیاست کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر مذہبی سیاسی جماعتوں نے دعوت کا کام پس پشت ڈال دیا ہے۔ انہیں سیاسی سرگرمیوں سے فرصت ہی نہیں کہ وہ لوگوں تک دین کے جامع تصور کی دعوت پہنچا سکیں۔ بلکہ اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ خود ان جماعتوں کے وابستگان کی ذاتی زندگیوں میں بھی دین کا عمل دخل واجبی سا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ تو اب ہمہ وقت "SHORT CUT" کی تلاش میں رہتے ہیں جو انہیں اقتدار تک پہنچا دے، چاہے اس کے لئے

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

پاکستان ٹیلی ویژن مشرقی عورت کو مغرب کی دہلیز پر لانا چاہتا ہے

عورت کو اپنے انسان ہونے پر شک کیوں ہے؟

عورت کا برابری اور مساوات کا دعویٰ قانون فطرت سے بغاوت کے مترادف ہے

نعیم اختر عدنان

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا الیکٹرانک میڈیا آج کل خواتین کے حوالے سے خاصا سرگرم ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر "حوا کی بیٹی" کے نام سے ہفتہ وار بنیادوں پر گزشتہ کئی ہفتوں سے پروگرام ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہے۔ اس پروگرام میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے مرد اور خواتین شریک ہوتے ہیں۔ ۱۲ نومبر کو دکھائے جانے والے پروگرام کا بنیادی نقطہ اور مرکزی خیال یہ تھا کہ عورت کو "object" یعنی شے تصور کیا جاتا ہے جس کا مظہر یہ ہے کہ عورت کو یا تو محض گھریلو عورت سمجھا جاتا ہے یا اسے معشوقہ قرار دیا جاتا ہے۔ عورت کو بحیثیت انسان وہ مقام نہیں دیا جاتا جس کی وہ مستحق ہے۔

آج کا متمدن اور ترقی یافتہ معاشرہ بحیثیت مجموعی آسمانی ہدایت سے ناآشنا اور مذہب سے برگشتہ ہو چکا ہے۔ موجودہ دور کے انسان کا اصل روگ یہ ہے کہ وہ اپنے خالق حقیقی اور پروردگار کو مکمل طور پر فراموش کر چکا ہے۔ اسی خدا فراموشی کے نتیجے میں انسان نے ہدایت ربانی سے بھی اپنا ناطہ توڑ لیا ہے۔ چنانچہ اب انسان بے لنگر کے جہاز اور کٹی ہوئی پتنگ کی طرح حیران و سرگرداں ہے۔ گویا وہ اپنے مقام و مرتبے اور فرض کو مکمل طور پر بھول چکا ہے۔ رب کائنات نے جمادات، نباتات، حیوانات حتیٰ کہ جنات اور ملائکہ پر بھی انسان کو فضیلت و بزرگی عطا کر کے اسے صرف اشرف المخلوقات ہی نہیں قرار دیا بلکہ دنیا کی خلافت و نیابت سے بھی سرفراز فرمادیا۔ کائنات کی تکوینی حاکمیت تو اللہ ہی کے پاس ہے مگر "خلافت" کی صورت میں انسان کو تشریعی حکومت عطا کر دی گئی۔

حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ پر مشتمل اولین انسانی جوڑے سے قافلہ انسانیت کا آغاز ہوا۔ شرف انسانیت میں بلاشبہ مرد و عورت دونوں شریک ہیں، اس کا کوئی بھی انکاری نہیں ہے، البتہ دونوں کی جسمانی ساخت اور ذہنی بناوٹ ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں متضاد بھی ہے۔ مرد کو جسمانی طور پر مضبوط اور عقلی طور پر زیادہ بالغ نظر بنایا گیا ہے تاکہ وہ خالق حقیقی کی طرف سے ودیعت کردہ صلاحیتوں کو کام میں لا کر اپنے فرائض سے عہدہ برا ہو سکے۔ چنانچہ اس کارگہ حیات میں انسانی گاڑی کے اس حصے کے ذمہ سخت قسم کی جسمانی اور ذہنی مشقت لگا دی گئی۔ آسمانوں پر کمند ڈالنے سے لے کر صنف نازک اور بچوں کی کفالت و نگہداشت تک قدرت نے مرد کے سپرد کر دی۔ مردوں کی اکثریت بغیر کسی احساس کمتری کے اپنے اس تخلیقی اور قدرتی فریضے کو ادا کر رہی ہے۔

> "عورت کا اپنے فطری اور تخلیقی فرض سے فرار ہی وہ اصل سبب ہے جس نے عورت کو اس کے شرف انسانیت کے بارے میں بھی شک و ریب میں مبتلا کر دیا ہے"

اس امر میں کسی کو بھی کلام نہیں ہے کہ مرد ہی کی طرح عورت بھی شرف انسانیت سے پوری طرح بہرہ ور ہے۔ مرد کے برعکس عورت کی جسمانی ساخت میں لطافت، حساسیت اور دلکشی و رعنائی ہر دیکھنے والی آنکھ کو نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ اس لئے کہ کائنات کے خالق و مالک نے قافلہ انسانیت کے تسلسل، اس کی نشوونما اور تہذیب و تربیت کی عظیم ذمہ داری عورت جیسی محترم و مقدس ہستی کے سپرد کر دی ہے۔ مرد و خواتین پر مشتمل انسانی کنبہ اپنی آفرینش سے لے کر اپنی فنا تک اسی طرح رواں دواں ہے اور رہے گا۔

سیکولر مغرب کی لادینی تہذیب کے زیر اثر خدا فراموشی اور مذہب سے دوری کا ایک نتیجہ عورت اور مرد کے مابین آویزش اور کشمکش کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس مصنوعی رقابت کا نقطہ عروج یہ ہے کہ وہ عورت جو تعلیم کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوئی، اس نے ماں، بیٹی، بہن اور بیوی کے حد درجہ باعزت اور پروقار مقام و مرتبے اور تحفظ و کفالت کے ماحول کو نظرانداز کر کے محفوظ دائرے کو کاٹ دیا۔ جدید تعلیم سے مزین اور "اپنے حقوق" سے آگاہ عورت نے گھر کی چار دیواری میں انسانیت کی نئی نسل کی پیدائش و پرورش اور تربیت کی ذمہ داری کو کم تر اور فضول بوجھ سمجھ کر مردوں کے شانہ بشانہ آنے کی غیر فطری جدوجہد اور لاحاصل کوشش شروع کر دی۔ اسی بے کار اور لاحاصل جدوجہد کو "حقوق نسواں" کے علمبردار "آزادی نسواں" کا دلفریب مگر گمراہ کن نام دے کر عورت کی فطرت کی طرف سے عائد کردہ بنیادی ذمہ داری اور اصل فرض سے دور کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی تعلیم یافتہ اور فیشن کی دلدادہ عورت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے مقدس و محترم رشتوں کی بجائے اپنے آپ کو ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، فضائی میزبان، ماڈل گرل، گلوکارہ اور ایکٹریس کے روپ میں دیکھنا پسند کرتی ہے۔

عورت کا اپنے فطری اور تخلیقی فرض سے فرار ہی وہ اصل سبب ہے جس نے عورت کو اس کے شرف انسانیت کے بارے میں بھی شک و ریب میں مبتلا کر دیا ہے، علم آگہی کے زمانے میں علم کے زیور سے آراستہ خواتین جب تک فاطر فطرت کے مقرر کردہ دائرے میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے دل و جان سے آمادہ نہیں ہوتیں، اس وقت تک آج کی جدید عورت کو اپنے شرف انسانیت پر شک ہی رہے گا اہل نظر اور اہل خبر اس حقیقت سے اچھی طرح

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

جماعت اسلامی کو کراچی میں کام کے مواقع ملے مگر....

کوئی انقلابی جماعت محض رفاہی کاموں میں الجھ کر وقت ضائع نہیں کرتی

گیاہ ضعیف

انقلاب کا نام لینے والوں کی سرگرمیاں دعوت سے زیادہ سیاست کے گرد گھومتی ہیں!!

سابق امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کی کراچی کی صورت حال کے بارے میں ایک تحریر ملک کے مختلف اخباروں میں شائع ہوئی ہے' جس میں انہوں نے کراچی کے موجودہ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے کردار کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔

"مجھے افسوس ہی نہیں شرمندگی بھی اس بات پر ہے کہ جماعت اسلامی کا کراچی بلدیہ پر آٹھ سال مکمل کنٹرول رہا۔ لیکن میرے ساتھیوں نے وہاں کی آبادی کو انصاف فراہم کرنے اور ان کی شکایات کو سمجھنے اور رفع کرنے اور کرانے کا انتظام نہ کیا۔ حالانکہ وہ خود بھی اس کمیونٹی سے تعلق رکھتے تھے اور جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت نے ان کو کئی بار دعوت بھی دی کہ سندھ کی حکومت میں شامل ہو کر یہاں کے مسائل حل کرنے اور کرانے کا انتظام کر لو لیکن وہ پیپلز پارٹی اور اس کے ہمنواؤں کے' جو خود مارشل لاء کی پیداوار تھے' مارشل لاء کی بی ٹیم کے طعنہ کی تاب نہ لا سکے۔ مگر انہیں سوڈان کے جنرل کی حمایت میں کوئی عار نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کراچی کے نوجوان اٹھ کھڑے ہوئے اور حالت یہاں تک پہنچ گئی اور اب بھی کوئی نہیں جو ان کی مشکلات کو سمجھے اور رفع کرنے کے لئے آواز اٹھائے اور حکومت کو روکے اور کراچی کے اس ناسور کو شفا سے ہمکنار کرنے کے لئے فکر مند ہو"

میاں صاحب محترم کی حق گوئی اور بیباکی ہمیشہ مسلم رہی ہے اور مندرجہ بالا عبارت کو تحریر کرتے ہوئے وہ ان آیات قرآنی پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ "اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لئے گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو"۔

میاں صاحب نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ "جماعت اسلامی کا کراچی بلدیہ پر آٹھ سال مکمل کنٹرول رہا لیکن میرے ساتھیوں نے بھی وہاں کی آبادی کو انصاف فراہم کرنے اور ان کی شکایات کو سمجھنے اور رفع کرنے اور کرانے کا انتظام نہ کیا"۔ لیکن یہ بات بھی روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس میں ان کے ساتھیوں کو مکمل طور پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ بات میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کیونکہ اس آٹھ سال کے دور اول میں' میں خود بھی جماعت اسلامی کے کراچی کے کارکنان میں شامل رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عرصے کے دوران کراچی کی بلدیہ عظمیٰ کا کنٹرول جماعت اسلامی کے پاس رہا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بلدیہ عظمیٰ کے کاموں کی تکمیل کے لئے کارکنان جماعت (میئر اور کونسلرز)

> "انقلاب اور اصلاح احوال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انقلاب بنیادی تبدیلی کا نام ہے جس کیلئے انقلابی جدوجہد ناگزیر ہے۔ کوئی انقلابی جماعت ملک میں جاری نظام کا حصہ بن کر انقلاب برپا نہیں کر سکتی"

کو ان ہی بیوروکریٹس پر انحصار کرنا پڑتا تھا جو موجودہ نظام کے کارندے ہیں اور جن کی بدعنوانیاں زبان زد عوام ہیں۔

اس دور میں جماعت اسلامی کو دو مجبوریاں لاحق رہی ہیں اور اب بھی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دعویٰ تو اسلامی انقلاب برپا کرنے کا کرتی ہے لیکن اس انقلاب کے لئے جو راستہ اس نے اختیار کیا ہے وہ موجودہ نظام میں اصلاح کا ہے۔ حالانکہ انقلاب اور اصلاح احوال میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انقلاب بنیادی تبدیلی کا نام ہے جس کے لئے انقلابی جدوجہد ناگزیر ہے۔ کوئی بھی انقلابی جماعت ملک میں جاری نظام کا حصہ بن کر انقلاب برپا نہیں کر سکتی۔ نظام کا حصہ بن کر وہ زیادہ سے زیادہ کوئی جزوی اصلاح ہی کر سکتی ہے اس میں بنیادی تبدیلی برپا نہیں کر سکتی۔ جبکہ اسلامی انقلاب ایک ہمہ گیر انقلاب کا نام ہے' جس کے ذریعہ انفرادی سطح پر عقائد' عبادات اور رسومات میں تبدیلی واقع ہوتی ہے تو اس کے بالکل متوازی اجتماعی سطح پر معاشرت' معیشت اور سیاست میں بھی بنیادی تبدیلیاں لائی جاتی ہیں۔ اس کی دوسری مجبوری یہ ہے کہ (پتہ نہیں اب ہے یا نہیں البتہ اس وقت کسی نہ کسی حد تک تھی) وہ اپنے اصولوں کو قربان کر کے اور حالات سے سازگاری اختیار کر کے لوگوں کے کام نہ کر سکتی ہے اور نہ کروا سکتی ہے۔ بلدیہ عظمیٰ میں لوگوں کے کام اس کے بدعنوان بیوروکریٹس کے ذریعہ کروانا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ لہٰذا لوگوں سے معذرت خواہانہ رویہ ہی اختیار کئے رہنا پڑتا تھا۔ میئر جماعت اسلامی کا ہوتا تھا لیکن کام کے لئے پیپلز پارٹی کے ڈپٹی میئر کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں کیونکہ بدعنوان افسروں کی ضروریات پوری کرنا ان کے لئے مشکل نہ تھا۔ جماعت اسلامی کے کونسلرز نہ کسی کی غلط سفارش کر سکتے تھے نہ ہی "Under hand dealing" کرنا ان کے لئے ممکن تھا۔

میرا اپنے محلہ کے کونسلر کے ساتھ کئی بار KDA کے ڈائرکٹر جنرل کے پاس جانا ہوا تو میں نے دیکھا کہ کونسلر صاحب اپنا وزیٹنگ کارڈ "صاحب" کے اردلی کے ذریعے اندر بھجوا کر انتظار کر ساعتیں گنا کرتے تھے۔ اس کے باوجود اگر کراچی میں اس عرصہ میں بلدیاتی سطح پر ترقیاتی کام ہوئے تو اس کا کریڈٹ جماعت اسلامی کے کونسلرز کو جاتا ہے کہ انہوں نے

ان ناسازگار حالات میں بھی کام کر کے دکھایا۔ لہٰذا "پل بنا چاہ بنا مسجد و محراب بنا" والی کیفیت تو پیدا ہو ہی گئی۔ اس کامیابی نے ان کے اندر خوش فہمیاں پیدا کیں کہ انہوں نے بڑا تیر مار لیا۔ حالانکہ ترقیاتی کام کروانا ان کا ہدف ہی نہ ہونا چاہئے تھا۔ یہ کام تو کوئی بھی تنظیم کر سکتی تھی۔ ان کا اصل کام تو یہ تھا کہ وہ بلدیہ عظمیٰ کے بدعنوان عناصر کے اخلاق و کردار میں تبدیلی کی کوشش کرتے۔ اس لئے اگر ایک جانب وہ ترغیب و تشویق سے کام لیتے تو دوسری جانب بحیثیت میئر و کونسلرز وہ اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے انذار و تبشیر سے بھی کام لے سکتے تھے۔ ایک داعی جماعت کا اولین فریضہ دعوت ہی ہوتا ہے۔ لیکن جماعت اسلامی کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ سیاسی گورکھ دھندوں میں پڑ کر وہ اپنے بنیادی کام کو فراموش کر چکی ہے۔ اس کا اندازہ اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو حالیہ اجتماع عام سے قبل امیر جماعت اسلامی کی جانب سے جاری ہوا ہے' جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ اجتماع عام کی نوعیت دعوتی اور تبلیغی "بھی" ہوگی۔ گویا کہ اس کی اصل نوعیت کچھ اور ہی ہے اور یہ سیاسی "شو" کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

اب آیئے اس معاملے کے دوسرے پہلو کی جانب۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی کے کونسلرز کی اپنے اپنے حلقوں میں پنچایت کمیٹیاں ہوتی تھیں' جس کے وہ چیئرمین ہوا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر جماعت اسلامی کے کارکنان ہی اس کمیٹی کے رکن ہوا کرتے تھے۔ علاقے کی سطح پر لوگوں کے تنازعات ان کمیٹیوں میں پیش کئے جاتے تھے۔ یہ اس معاملہ کا وہ گوشہ تھا جہاں چیئرمین صاحب اپنے اختیارات کو بروئے کار لا کر مقامی سطح ہی پر سہی کچھ فیصلے قرآن و سنت کی بنیاد پر کر سکتے تھے۔ لیکن اسلام کے قوانین سے اکثر و بیشتر کارکنان جماعت کلی واقفیت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی ان کمیٹیوں میں اہل علم کی کوئی نمائندگی ہوتی تھی لہٰذا عمومی طور پر لوگوں کے معاملات کے لئے پولیس اور عدالت سے رجوع کیا جاتا تھا۔ لہٰذا لوگ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

کیونکہ ان "صالح" لوگوں کی بناء پر اکثر و بیشتر ان کے کام رک جاتے تھے۔

لوگوں کی اس کیفیت سے ایم کیو ایم کے نوجوانوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بلدیہ عظمیٰ پر ان کے مختصر کنٹرول کے دور میں اتنے ترقیاتی کام ہو گئے جتنے شاید قیام پاکستان سے اب تک نہ ہوئے تھے اور اس طرح انہوں نے جماعت اسلامی کے ترقیاتی کاموں کے کارنامہ پر خط تنسیخ پھیر دی۔ ایسے میں لوگ کیوں نہ ایم کیو ایم کے دیوانے ہوتے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے جو غلط حربے اختیار کئے آج وہی حربے صاحبان اقتدار اس کے خلاف استعمال کر رہے ہیں اور کراچی کے عوام ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کی دوہری چکی تلے پس رہے ہیں۔

میری میاں صاحب سے مودبانہ گزارش ہے کہ جماعت اسلامی کے کارکنان کی تربیت کا کچھ اس طرح اہتمام فرمائیں کہ لوگوں کے افکار و نظریات کے بنیادی کام کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو۔ یہ کام صرف لٹریچر کی تقسیم کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک تو جماعت کے خلاف عمومی فضا دوسروں کی کتابوں کے پڑھنے کی وجہ سے اچھی نہیں ہے۔ لوگوں

"اگر آپ ووٹ کی پرچی کے ذریعے انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو پہلے لوگوں کی فکر میں انقلاب برپا کرنا پڑے گا۔ سیکولر ذہن اسلامی انقلاب کے داعیوں کیلئے ووٹ نہیں ڈال سکتا"

کی بے اعتنائی کی وجہ سے اس تقسیم لٹریچر کے کام کی اہمیت پہلے کی طرح نہیں رہ گئی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہیں صرف دعوت ہی کے کاموں تک محدود کر دیا جائے البتہ دعوت کے بنیادی کام کو فراموش کر کے وقتی سیاسی ہنگاموں میں اپنے قیمتی اوقات کے بیشتر حصہ کو صرف کر کے کارکنان جماعت نہ تو خود اپنی اصلاح پر توجہ دے سکتے ہیں اور نہ قوم کی فکر میں کوئی تبدیلی برپا کر سکتے ہیں۔ سیاست دین سے الگ کوئی شے نہیں' اس کا میں بھی قائل ہوں لیکن سیاست دین کا صرف ایک گوشہ ہے اور دین کے ایک ہی گوشے پر اپنی توانائیوں کا بیشتر حصہ صرف کر کے انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ ووٹ کی پرچی کے ذریعہ انقلاب لانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے لوگوں کی فکر میں انقلاب برپا کرنہ پڑے گا۔ سیکولر ذہن اسلامی انقلاب کے داعیوں کے لئے ووٹ نہیں ڈال سکتا۔ لیکن لوگوں کی سوچ میں تبدیلی برپا کرنے سے پہلے اپنی ذاتی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنی پڑے گی۔ ہم خود کو تبدیل کرنے کے لئے تیار نہ ہوں اور چاہیں کہ ساری دنیا کے لوگ تبدیل ہو جائیں تو یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی کا کارکن دینی جماعت کے کارکن سے زیادہ کسی سیاسی جماعت کا کارکن ہی نظر آتا ہے۔ اس کی صرف ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ جہاں جماعت کے دو چار کارکن جمع ہو جائیں وہاں عموماً موضوع سخن سیاست ہی ہوتا ہے۔ علی ھذا القیاس

اسلامی انقلاب نبی اکرم ﷺ کے نقش قدم پر چل کر ہی آ سکتا ہے اور اقتدار کبھی ان کا مطمح نظر نہیں رہا اور نہ صحابہ کرام و اولیاء عظام کا رہا ہے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے۔ اور عوامی مسائل بھی حضور ﷺ کا ہدف نہیں رہے حالانکہ اس دور جاہلیت میں آج سے زیادہ عوامی مسائل گھمبیر تھے۔ ان کا ہدف تو فرد کی اصلاح ہی رہا ہے۔ ہمیں بھی یہی کام کرنا پڑے گا۔ اصلاح کے لئے الاقرب فالاقرب کی ترتیب پر عمل کرتے ہوئے پہلے اپنی ذات' اپنے زیر اثر افراد اور معاشرہ کو ہدف بنانا پڑے گا اور ان سطحوں پر کامیابی ہو گئی تو اہل اقتدار کی اصلاح لوگ خود ہی کر دیں گے۔ اگر یہ نہ ہوا تو جماعت اسلامی کو بھی مسائل کے حل کے لئے ضیاء الحق جیسے کسی ڈکٹیٹر کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ حالانکہ مولانا مودودی مرحوم نے اپنی تحریروں میں کسی بھی آمر کی مدد کے ذریعہ اسلامی انقلاب کو ناممکن العمل بتایا ہے۔ ویسے جب مولانا مرحوم کی تحریروں کا تذکرہ آ ہی گیا ہے تو میں یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج ان کا پیش کردہ کون سا اصول ہے جس کی نفی جماعت کے "اہل اقتدار" نہیں کر رہے۔ بحالت موجودہ اس کی توقع نہیں کہ جماعت اسلامی کے اکابرین اپنی پالیسی میں تبدیلی کریں گے۔ بہرحال "نیک و بد سمجھانا" ہمارے فریضہ میں شامل ہے۔

بقیہ : ابلاغیات

آگاہ ہیں کہ اپنے مقصد تخلیق کو نظر انداز کرنے والی کوئی شے بھی دنیا میں اپنا اصل مقام اور مرتبہ حاصل نہیں کر سکتی' بالکل اسی طرح آج کی تعلیم یافتہ' مہذب اور تہذیب جدید پر فریفتہ و نثار عورت گھر کی زینت بن جائے تو وہ "شمع محفل" کے روپ میں مرد کے ہوس پرستانہ جنسی اور سفلی جذبات کی تسکین سے محفوظ ہو جائے گی۔ تب عورت کو اس کے خالق کی طرف سے عطا کردہ شرف انسانیت سے نہ کوئی دوسرا محروم کر سکتا ہے اور نہ خود عورت ہی کسی شک و شبہ میں مبتلا رہے گی۔ OO

"خلافت" کے ادارہ کی اہمیت کا امت مسلمہ کو ادراک نہیں!

پورے اسلام پر عمل نظام خلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ہے

امت مسلمہ کا حقیقی وجود خلافت کے ادارے کے ساتھ مشروط ہے

جناب ابن عبداللہ کی کتاب "سبیل المومنین" سے ماخوذ

تاریخ شاہد ہے کہ جب رسول اکرمؐ کی وفات ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے جس کام کو سب سے اہم سمجھا اور جسے ہر دوسرے کام پر مقدم رکھا وہ نائب رسول کا انتخاب اور نظام خلافت کا قیام تھا' حتیٰ کہ تدفین کے فریضے کو بھی موخر رکھا گیا۔ اور پھر بعد میں بھی ہمیشہ ایسا ہی کیا' جب کسی خلیفہ کا انتقال ہوا اس وقت تک اسے دفن کرنے کے فریضے کی طرف متوجہ نہ ہوئے جب تک اس کے جانشین کا انتخاب نہ کر لیا۔

اس جماعت مقدسہ کا اس بات پر اجماع تھا کہ مسلم معاشرہ کسی وقت بھی ایک امام و خلیفہ کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتا۔ قرآن حکیم میں اہل ایمان کو ہمہ وقت مسلمان کی زندگی گزارنے اور اسی کیفیت میں موت کا استقبال کرنے کا جو تاکیدی حکم دیا گیا ہے اس سے یہی مراد ہے کہ وہ ایک لمحہ بھی خلافت کے بغیر نہ رہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ سورۃ النساء کی آیت ۱۱۵' ۱۱۶ میں سبیل المومنین سے مراد جماعت صحابہؓ کا راستہ ہے اس لئے کہ قرآن نے انہیں ہی سچے اور پکے مومن قرار دیا ہے لہٰذا جو لوگ جماعت صحابہؓ کے طریقے میں تبدیلی کر کے کوئی اور راستہ اختیار کر لیں گے وہ مشرک ٹھہرائے جائیں گے اور اپنے نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کے باوجود جہنمی قرار دیئے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ دین اسلام کے متوازی اور بالمقابل کسی دوسرے طریقے کی پیروی کرتے ہیں وہ بیک وقت دو خداؤں کی بندگی کرتے ہیں۔

ایک صاحب نے اعتراض کیا ہے کہ یہ بات لازم نہیں ہے کہ جو لوگ طریق صحابہؓ اختیار کر کے امام المسلمین کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں صرف وہی ہدایت یافتہ ہوتے ہیں کیونکہ سورۂ بقرہ کی ابتداء میں ہدایت اور فلاح کے لئے جو پانچ شرائط بتائی گئی ہیں ان میں یہ شرط موجود نہیں ہے کہ امت مسلمہ میں ہمہ وقت خلیفہ و خلافت کی موجودگی لازمی ہے یعنی :

"اس کتاب میں کوئی شک نہیں' یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کیلئے جو ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور اللہ کے دیئے میں سے خرچ کرتے ہیں اور (اے نبیؐ) جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اور جو تم سے پیشتر نازل کیا گیا ہے اس سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی سیدھی راہ پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والوں میں سے ہیں"۔

اگر ان پانچ شرائط کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خلیفہ و خلافت کے بغیر ان ساری شرائط کی پابندی ہو ہی نہیں سکتی' مثلاً اقامت صلوٰۃ اور نظام زکوٰۃ کا لازمی تعلق اسلامی ریاست سے ہے۔ لیکن اس سے بھی آگے ہماری یہ غلط فہمی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن نازل کیا گیا ہے۔ آپؐ پر قرآن کے ساتھ "میزان" بھی نازل ہوئی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو رسالت کے ثبوت کے لئے واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ دو چیزیں نازل فرمائیں' ایک کتاب اور دوسری میزان تاکہ لوگ انصاف پر کاربند ہوں"۔

میزان سے مراد عدالت ہے جو لوگوں کے باہمی تنازعات یا اختلافات کے متعلق کتاب و سنت کا منشا ظاہر کرتی ہے یا دوسرے الفاظ میں فیصلہ دیتی ہے۔ چنانچہ جب تک نبیؐ بنفس نفیس موجود تھے آپؐ کی ذات گرامی خود میزان کی حیثیت رکھتی تھی لیکن آپؐ کے بعد امت کی ذمہ داری ہے کہ اس نظام کو قائم رکھے۔ کیونکہ کتاب و سنت کو اس کا اصل مقام دلانے کے لئے اس کے ساتھ ایسی بالادست قوت ضروری ہے جو عدالت کے فیصلوں پر عمل کرائے اور عدل صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں تمام انسانوں کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اسی طرح میزان کا عملی نمونہ خلافت راشدہ کی شکل میں تاریخ میں محفوظ ہو گیا لہٰذا امت کا کام انہیں قائم رکھنا ہے اور یہی اصل اسلام ہے۔ اس کے برعکس ہمارا جو طرز عمل ہے وہ یہودیت کی راہ ہے آپ کو معلوم ہے کہ مدینہ کے ارد گرد کئی یہودی بستیاں آباد تھیں اہل مدینہ جو اوس و خزرج دو عرب قبائل پر مشتمل تھے ان سے یہ سنتے آ رہے تھے کہ جزیرۃ العرب میں عنقریب آخری رسول آنے والا ہے۔ چنانچہ جب نبیؐ تشریف لائے تو ان دونوں قبائل نے آپؐ پر ایمان لانے میں ذرا تاخیر نہیں کی لیکن اہل یہود جنہوں نے مدنیہ والوں کو یہ راہ دکھائی تھی' خود جان بوجھ کر اندھے بن گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی یہودی آج کے مسلمانوں کی طرح مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جس کی وجہ سے علمائے یہود کے عیش تھے۔ عامۃ الناس کو ہر معاملے میں ان سے رجوع کرنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے انہیں قوم میں ایک مقام اور مرتبہ حاصل ہو گیا تھا جبکہ اسلام میں داخل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ان سارے مفادات سے نہ صرف یکسر محروم ہو جائیں بلکہ نبیؐ کی ماتحتی میں دین اسلام کی بالادستی کے لئے اپنے جان و مال کی قربانی بھی پیش

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

بقیہ : توجہ طلب

انہیں ایسے طور طریقوں کو اختیار کرنا پڑے جو دوسری سیکولر جماعتیں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا بصد ادب راقم آپ سے گزارش کرتا ہے کہ اسے آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کہ سید صاحب نے سو فیصد درست تشخیص کی ہے۔ اصل تشخیص تو یہ ہے کہ مذہبی سیاسی جماعتیں اسوۂ نبی اکرم ﷺ پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ ہوں۔ اس گلے سڑے نظام کا حصہ بننے کی بجائے انقلابی جدوجہد کا آغاز انہی خطوط پر کریں جن پر وہ نبی انقلاب ﷺ کو پاتے ہیں۔ دین کی مسلسل دعوت، نہی عن المنکر خصوصاً شرک کی مذمت اور آج کے دور کا بدترین شرک جس میں تقریباً خواہی نخواہی ہم سب ملوث ہیں، الا ماشاء اللہ، یعنی مادہ پرستی کا شرک، اس کی سخت ترین مذمت۔ کیونکہ اسی شرک کی کوکھ سے آج کے اکثر و بیشتر مسائل نے جنم لیا ہے۔ داعیان دین کو تو افضل البشر بعد الانبیاء ابوبکر صدیقؓ کے اس قول کو حرز جاں بنا لینا چاہئے کہ "لایصلح آخر هذه الامه الا بما صلح بها اولها۔" کہ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکتی مگر اسی طریق پر جس پر اس امت کے پہلے حصہ کی اصلاح ہوئی ہے۔ سید صاحب جیسے اکابرین کو اسی زاویہ نگاہ سے بھی اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہئے کہ کہیں ان کے دلوں کے سنگھاسن پر مادہ پرستی کے شرک کا قبضہ تو نہیں جو انہیں ان آسائشوں اور مراعات سے عہدہ برآ نہیں ہونے دیتا جو ارکان اسمبلی اور سینٹرز کو حاصل ہیں۔ حالانکہ ان کی عظیم اکثریت اب اس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہے، خواہ وہ زبان سے اس کے اظہار کی جراءت نہ رکھتے ہوں کہ ملک میں رائج انتخابی نظام کے ذریعہ وطن عزیز میں اسلام کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔

بقیہ : حاصل مطالعہ

کریں۔ گویا علمائے یہود نے اپنے مفاد کے لئے اپنی قوم کو اسلام میں داخل ہونے سے روکا تھا اور ہم نے اپنے مفادات کے لئے اسلام کے نظام کو ہی تج دیا۔ جماعت صحابہؓ نے کتاب و سنت کی عملاً پیروی کے لئے اپنے میں سے ایک امام المسلمین کا انتخاب ضروری جانا۔ یعنی بعد رسالت کتاب، سنت، خلافت اور عدالت چار ستون تھے جن پر اسلام کی عمارت قائم تھی۔ جب یہ نہ رہا تو امت فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئی اور اب اسی پر قانع ہو کر بیٹھ رہی ہے حالانکہ نہ یہ اسلام ہے اور نہ یہ صحیح معنوں میں امت مسلمہ!OO

جاگیردار اور تعلیم

جناب مسعود مفتی

عوام کو تعلیم سے دور رکھ کر ہم نے انہیں معذورین کی صف میں شامل کر دیا ہے۔ برعظیم کی تقسیم کے بعد بلا استثناء جو حکومت بھی یہاں آئی ہے اس نے دانستہ ایسی پالیسی اپنائے رکھی ہے کہ جس سے تعلیم کے میدان میں ایک حد سے آگے پیش رفت نہ ہو۔ اس لئے کہ جاگیردارانہ ذہنیت کا یہ خاصہ ہے کہ عوام میں بیداری کے عوامل کو پروان چڑھنے سے روکا جائے۔ چونکہ کوئی بھی حکومت ہو، یہاں تک کہ مارشل لاء کی جڑ بنیاد بھی یہاں کے جاگیردار اور وڈیرے ہوتے ہیں، لہٰذا تعلیم کے بارے میں اس کی پالیسی میں رتی برابر فرق واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ تعلیم ہو گی تو اس سے حالات میں لامحالہ تبدیلی آئے گی۔ قدرت اللہ شہاب نے جو سیکرٹری تعلیم رہے تھے "شہاب نامہ" میں کھل کر جاگیرداروں کے تعلیم سے عداوت کے قصے بیان کئے ہیں۔

آج یہ شعبہ بربادی کا ایک مرقع بن چکا ہے۔ ایک طرف حکومت کے قائم کردہ نام نہاد تعلیمی ادارے ہیں جو اپنی بے سروسامانی، بدنظمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے فقدان کا خود ماتم کر رہے ہیں جبکہ دوسری جانب پرائیویٹ تعلیمی ادارے ہیں جو والدین کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منافع پر منافع کما رہے ہیں۔ اس پر مستزاد حکومت کے یہ مضحکہ خیز اعلانات کہ ۲۱ویں صدی کا استقبال ہم "ایشیائی چیتے" کی حیثیت سے کرنے والے ہیں!! بہرحال یہ طے ہے کہ جب تک یہاں جاگیردارانہ نظام موجود ہے تعلیم ہم سے منہ چھپاتی رہے گی۔OO

(بشکریہ : روزنامہ "ڈان" ۲ جون ۱۹۹۵ء)

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

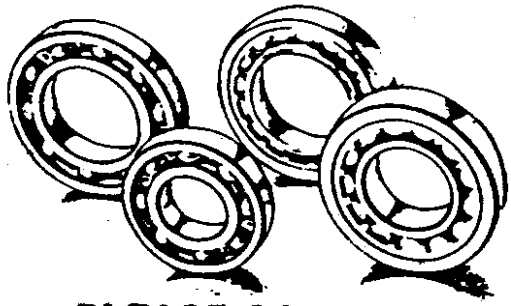

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24624 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734778

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) — Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : — 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41780-210807

MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

بقیہ : مکتوب کراچی

دینی جماعتوں کی آپس کی آویزش سے قبضہ گروپ کو فائدہ پہنچا ہے۔ ان کے راستے میں ایسا کوئی بڑا پتھر نہیں ہے جسے ہٹانے میں دشواری پیش آئے۔

دین کے ان نمائندوں کا یہی حال رہا تو عنقریب ایک وقت آئے گا جب یہ چاہیں گے بھی تو اکھٹے نہیں ہو سکیں گے۔ انہیں پھاڑ کر ہمیشہ کے لئے ان کی آواز کو دبا دیا جائے گا۔ یہ امریکہ کے نیو ورلڈ آڈر کا حصہ ہے جس کا ایک فیز شروع ہو چکا ہے۔ امریکہ خود لڑنے نہیں آئے گا وہ ہمارے عوام کو ہمارے علماء کے آمنے سامنے کھڑا کر دے گا اور عوام ہی ان دینی قوتوں کی پگڑیاں اتار لیں گے۔

ہمارے مولوی حضرات بھی لسانی اور صوبائی عصبیتوں کے اتنے ہی اسیر ہیں جتنے دوسرے قوم پرست ہیں۔ نیو ورلڈ آڈر ان کو آسانی سے شکار کر لے گا' یہ خود نیو ورلڈ آڈر کا آلہ کار بن جائیں گے۔ امت کی وحدت کے تصور کو پامال کرنے والی چیز یہ لسانی و صوبائی عصبیتیں ہیں۔ ان کے سدباب کے لئے جو تجویز بھی آئے گی سب سے پہلے یہی دینی طبقہ مزاحم ہو گا اور قوم پرست ان کو آگے کر کے انہیں ڈھال بنا لیں گے۔ آج جو ظلم کراچی میں ہو رہا ہے اور قانون کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے' علماء کی طرف سے بالکل خاموشی ہے۔ آئندہ آنے والے دنوں میں جب یہی تاریخ علماء پر دھرائی جائے گی' اور یہ بھی نیو ورلڈ آڈر کا حصہ ہے' تو عوام بھی خاموشی ہی میں اپنی بہتری سمجھیں گے۔ ان کے پیچھے کھڑے ہو کر نعرہ لگانے والا کوئی نہ ہو گا۔ ویسے بھی انہوں نے معاشرے میں اپنے کردار کا کوئی مینار نصب نہیں کیا ہے۔

اب بھی وقت ہے کہ یہ حضرات اپنے گھروندوں سے نکلیں' آنے والے خطرات کو سمجھیں' ایک بڑی اجتماعیت کو منظم کریں' چھوٹے چھوٹے اختلاف کو بھلا دیں' مسلکوں کی باتوں کو اپنی مساجد تک محدود کر دیں اور پوری فراخدلی کے ساتھ ایک دوسرے کی بات کو سمجھیں' امریکہ نے جو بساط بچھائی ہوئی ہے اس سے آگاہی حاصل کریں اور اس سے بچنے کی تدابیر پر غور کریں۔ اس لئے کہ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ کراچی کے حالات ایک "ٹیسٹ کیس" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اس پر کوئی ردعمل سامنے نہ آیا تو پوری قوم ایک بڑے طوفان کے زد میں آجائے گی۔ اور طوفان تو طوفان ہوتا ہے۔ سب کو بہا لے جائے گا۔OO

بقیہ : نقطہ نظر

سر تھوپ دیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم خود کیا کر رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر پوری مسلم دنیا کا یہی حال ہے اور اس کے اصل ذمہ دار ہمارے اپنے حکمران ہیں۔ ورنہ مصر اور الجزائر میں تو بھارت یا یہودی لوگوں کو قتل نہیں کر رہے۔ بہرحال پاکستان میں اب بھی موقع ہے۔ اگر ایک دفعہ ہم دنیاوی مفادات کو پس پشت ڈال کر اسلام کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو دنیا اور آخرت دونوں بچا لیں گے ورنہ دنیا بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ ایم۔ کیو۔ ایم اور کراچی کے مہاجروں کو میرے خیال میں اپنی حکمت عملی دوبارہ ترتیب دینا ہو گی۔ (واللہ اعلم)

بقیہ : پس منظر

پرست عیسائی ہیں۔ جن کی سوچ پر بائبل میں درج پیشینگوئیوں کا گہرا اثر ہے۔ یہ پیشین گوئیاں آرمڈ گان اور یہودیوں کی سرکشی سے متعلق ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گروپ آگے چل کر جب شخصی آزادی کے لئے زور لگائیں گے تو امریکہ میں دہشت گردی میں اضافہ کا باعث بنیں گے۔ جس کے لئے اوسط آدمی کے وسائل میں تنگی' ملازمتوں میں کمی' سماجی خدمات میں کٹوتی' علاج کے لئے اخراجات میں اضافہ' جرائم منشیات اور اخلاقی زوال کے سبب فضا تیار دکھائی دیتی ہے اور مزید نوجوانوں کا ان گروہوں کی جانب راغب ہونا آسان ہو گیا ہے۔

بقیہ : واقعات عالم

صورتحال سے نجات حاصل کرنے میں اپنے آپ کو وقف کرے۔ مسلمانوں میں ایسے قابل قدر عناصر کی کمی نہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی ایک نظم کے تحت رہ کر ٹھوس اور مثبت بنیادوں پر عملی کام کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آخر میں مخلص اور بے لوث کام کرنے والے مسلم زعماء اور قائدین کی خدمت میں دست بستہ عرض ہے کہ خدارا اپنے جزوی اور وقتی مفادات کو ترک کر کے آگے آیئے اور اس بڑھتی ہوئی بے جا خون ریزی پر قابو پانے کی کوئی تدبیر کیجئے۔OO

بقیہ : حدیث امروز

عوام سرے سے بے قصور ہیں۔ عوام کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ کسی وقتی جذبے کے تحت تو میدان میں آکر بڑی سے بڑی قربانی بھی دے جاتے ہیں مگر ایک نظم کے تحت رہ کر مسلسل جدوجہد کے نہ وہ قائل ہیں اور نہ اس کے لئے آمادہ' حالانکہ سیدھی سی بات ہے کہ کوئی ٹھوس اور دیرپا مثبت تبدیلی اس وقت تک آ ہی نہیں سکتی جب تک کہ ایک ایسی منظم اور تربیت یافتہ عوامی قوت میدان میں موجود نہ ہو جو اپنے ذاتی مفادات پر اجتماعی مفادات کو ترجیح دے اور صرف اور صرف اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے جدوجہد کرے۔

ہمارے ملک میں کسی حکومت کو بدلنا کوئی بہت زیادہ مشکل کام نہیں' اس لئے کہ ایک طبقہ کو اس پر مکمل اجارہ داری حاصل ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس کے مفادات اور حق حکمرانی ہر حال میں محفوظ ہیں۔ ہاں' آپ نظام بدلنے کی کوشش کریں پھر پتہ چلے گا کہ کون کیا ہے اور کتنا اسلام کا دلدادہ ہے' لیکن یہ بات اپنی جگہ طے ہے کہ موجودہ جاگیردار اور سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کو بدلے بغیر اسلام کا عادلانہ نظام یہاں کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے جس طبقے سے' یعنی طبقہ علماء سے اصل امید ہونی چاہئے تھی وہ تو ابھی تک "منبر و محراب میں سو گیا کون؟" کے مصداق ہے۔ البتہ نوجوانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد اس ملک میں الحمدللہ موجود ہے جو صحیح معنوں میں اسلام کی شیدائی ہے' مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں مسلح افواج اور پولیس سے لڑانے کی بجائے صحیح نہج پر دین کا کام کرنے کی راہ سمجھائی جائے جس کے مراحل ہمارے نزدیک یہ ہیں : ۱) دعوت ۲) تنظیم ۳) تربیت اور ۴) پرامن مزاحمتی تحریک۔ حالات جس تیزی سے فیصلہ کن رخ اختیار کر رہے ہیں اس کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اسلام کے حوالے سے ہم منزل سے کتنے دور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح رخ پر جدوجہد کرنے کی توفیق دے۔OO

فرمودۂ اقبالؒ

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مثال نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

اس ملک میں طبقے دو ہی تو ہیں!!

ملک کے تمام شعبوں پر سرمایہ دار اور جاگیردار چھائے ہوئے ہیں

وطن عزیز میں موجود تمام لسانی و نسلی عصبیتیں انہی استحصالی طبقات کی پیدا کردہ ہیں

کراچی میں جن لوگوں کو نمائندگی کا دعویٰ ہے' دہشت گردی کی ذمہ داری بھی وہی قبول کریں!

ابن صالح

محترم جناب نجیب صدیقی کے مضمون "..... پردہ غیب میں کون؟" ندائے خلافت ۱۵ تا ۲۱ نومبر کے حوالے سے چند گزارشات پیش کرنا ہیں۔

پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پاکستان میں فی الواقع دو ہی طبقے یا قومیں ہیں۔ ایک جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا طبقہ ہے' جن میں اگرچہ مشکل سے چند سو خاندان شامل ہوں گے مگر سارے ملکی وسائل اور ذرائع پیداوار اس طبقہ کی مٹھی میں ہیں' قیام پاکستان سے لے کر آج تک ملک میں یہی طبقہ سیاہ و سفید کا مالک ہے' سیاست' تجارت' صنعت' وزارت' صدارت' فوج' بیوروکریسی غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس طبقے کی دسترس سے باہر ہو۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ طبقہ جتنا آج منہ زور اور طاقتور ہے اتنا پاکستان کے آغاز میں نہیں تھا لیکن مسلم لیگ ہو یا پیپلزپارٹی یا مارشل لاء' حکمران یہی طبقہ ہوتا ہے۔

دوسرا طبقہ عوام کا ہے جس کا کام صرف جلسے جلوسوں کی رونق بڑھانا اور اپنے "قائدین" اور "سیاسی راہنماؤں" کے حق میں نعرے بلند کرنا ہے یا پھر فوری نوعیت کے چھوٹے موٹے مسائل حل کروانے کے لئے حکمرانوں کے پیچھے جوتیاں چٹخانا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ حکومت کے دور میں عوام کے مسائل میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے مگر لوٹ کھسوٹ' کنبہ پروری' ناجائز ذرائع سے دولت کا حصول اور اخلاقی بے راہ روی کا آغاز پاکستان کے وجود میں آتے ہی شروع ہو گیا تھا۔

پاکستان میں اگرچہ مختلف علاقوں کے اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ آباد ہیں اور ان کے رسم و رواج اور رہن سہن ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں جس کی وجہ سے عین ممکن ہے کہ مقامی سطح پر کہیں نہ کہیں آپس میں مفادات کا ٹکراؤ ہو لیکن ملکی سطح پر نسلی اور لسانی بنیادوں پر شدید منافرت اور تصادم یقیناً حکمران طبقہ کی کارستانی ہے جو اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے جب چاہتا ہے عوام کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ چونکہ یہ حربہ برعظیم کی تقسیم میں کامیاب ثابت ہوا جس کے نتیجے میں اس طبقے کو ہاتھ رنگنے کا خوب موقع ملا لہٰذا اس نے مستقلاً یہ حربہ اختیار کر لیا ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ زبان' نسل اور علاقے کی بنیاد پر جو بھی منافرت اور تصادم کی فضا موجود ہے وہ صرف عوام میں ہے۔ طبقہ بالا میں مہاجر یا غیر مہاجر' پنجابی' پٹھان' سندھی' بلوچی' پیر' فقیر' عالم اور جاہل کی قطعاً کوئی تفریق یا تخصیص نہیں۔ سوائے اس کے کہ جہاں ان کے اپنے مفادات کا تقاضا نہ ہو۔

> "یہ بات سب کہتے ہیں کہ ایم کیو ایم کو کراچی میں فیصلہ کن نمائندگی حاصل ہے لیکن اس کے باوجود اگر دہشت گردی پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہے تو اسے کم از کم عوامی تحریک چلانے کا کوئی حق حاصل نہیں"

دوسری بات جو خاص طور پر توجہ طلب ہے یہ ہے کہ بنیادی انسانی رویئے کے لحاظ سے دونوں طبقوں میں کوئی زیادہ فرق موجود نہیں۔ خاص طور پر اسلام کے معاملے میں بے اعتنائی اور منافقت کا رویہ الا ماشاء اللہ قومی سطح پر موجود ہے۔ اسی طرح دنیا کی حرص و لالچ اور اس کے لئے ہر شے قربان کر دینے کا جذبہ امیر و غریب' اعلیٰ و ادنیٰ ہر ایک میں یکساں موجود ہے۔ غریب کے سامنے بھی اگر کوئی معیار ہے تو وہ دولت اور شہرت ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک عام آدمی کی اس تک رسائی ممکن نہیں رہی۔

ان حقائق کی روشنی میں اگر ہم ملکی معاملات کا جائزہ لیں خواہ وہ کراچی سے متعلق ہوں یا شیعہ' سنی مسئلے سے متعلق تو انہیں سمجھنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آنی چاہئے۔ اور یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ کراچی میں دہشت گردی اور بم حملے حکومت کروا رہی ہے یا ایم کیو ایم۔ کیونکہ ظاہر بات ہے کہ طبقہ بالا کا کوئی فرد بم پھینکنے نہیں آتا۔ اس ضمن میں دوسری بات یہ ہے' جیسا کہ سب کہتے ہیں ایم۔ کیو۔ ایم کو کراچی میں فیصلہ کن نمائندگی حاصل ہے لیکن اس کے باوجود اگر دہشت گردی پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہے تو اسے کم از کم عوامی تحریک چلانے کا حق بھی نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تنظیم اسلامی کبھی میدان میں آئی تو عملاً کیا کیفیت ہو گی لیکن اصولاً امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا یہ موقف صد فیصد درست ہے کہ جو جماعت یا تنظیم بیرونی عناصر کی جانب سے متوقع تخریب کاری سے اپنی صفوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتی اسے عوام کو سڑکوں پر لانے کا ہرگز حق حاصل نہیں۔ جلوس ہم نکالیں اور توڑ پھوڑ کوئی اور کر جائے' اس سے زیادہ ہماری نااہلی اور کیا ہو گی۔

میرے خیال میں یہ بھی بالکل بے معنی بات ہے کہ ہم ہر غلط کاروائی کا الزام بھارت اور یہودیوں کے

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

مکتوبِ کراچی

کراچی میں ہونے والے ظلم و ستم پر کوئی بھی صدائے احتجاج بلند کرنے والا نہیں!

بوسنیا، کشمیر اور فلسطین کے لئے تڑپنے والوں کو کراچی کیوں نظر نہیں آتا؟

علماء نے بھی کراچی سے اپنی آنکھیں موند لی ہیں لیکن یہ تاریخ ان پر بھی دہرائی جائے گی

کراچی والوں کے مینڈیٹ کا احترام ضروری ہے

نجیب صدیقی

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

جس طرح فرد ربط ملت سے قائم ہے اسی طرح ملت بھی فرد ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ افراد کو منتشر کر دیجئے، ملت منتشر ہو جائے گی۔ افراد کو ملت بنانے والی چیز نظریہ ہوتا ہے۔ یہ نظریہ جتنا ہم آہنگ، جتنا مربوط اور جتنا پرکشش ہو گا، ملت بھی اسی قدر مضبوط ہو گی۔ اس کے برعکس اگر آپ اس نظریہ ہی پر تیشہ چلا دیں، اسے مجروح کر دیں، اسے مشتبہ بنا دیں اور تفریق پیدا کر دیں تو وہ ملت بکھر جاتی ہے۔ اس کے بکھرنے کا دوسرا بڑا سبب مختلف عصبیتوں میں اس کا تقسیم ہو جانا ہے۔ پھر ان عصبیتوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی جنگ تو ملت کے وجود کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔

ملت کو برباد کرنے میں عدل اجتماعی کے عدم قیام کو بھی بڑا دخل ہے، جس معاشرے سے انصاف اٹھ جائے اور خیر و شر میں تمیز باقی نہ رہے، اس کی تباہی یقینی ہے اور وہ معاشرہ ملت واحد کے بجائے انتشار محض بن جاتا ہے۔ آج ہم اسی انتشار سے دوچار ہیں۔ یہ انتشار اب اپنے عروج پر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے پاکستان کسی مثبت نظریہ کے تحت نہیں بنایا تھا بلکہ اس کی تعمیر میں سب سے بڑا محرک ہندو کا خوف تھا۔ جب یہ خوف زائل ہوا تو ملت کے تصور کو پیر تلے روند دیا گیا، اور ہم مختلف دھڑوں میں بٹ گئے اور جنگل کے قانون کے تحت جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا عمل جاری ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ نظریات کی جگہ معاشی نظریات سوچ کا مرکز بنے اور اس کے حصول کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ اسی مقصد کے لئے دھڑے بنائے گئے۔ اجتماعیت کا قیام عمل میں آیا، فرزند زمین کا نعرہ لگایا گیا، زبان و کلچر کی دہائی دی گئی اور ایک قبضہ گروپ وجود میں آ گیا۔ اخلاقی قدریں پامال ہوئیں، اصول و نظریات بالائے طاق رکھ دیئے گئے، زبان سے وہ کہا جانے لگا جس کا عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ دستور کی موجودگی کے باوجود لاقانونیت کا راج ہے۔ اوپر سے نیچے تک کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، کوئی احتساب نہیں ہے۔ جس کا تعلق قبضہ گروپ سے نہیں ہے، وہ ذلیل و رسوا ہو رہا ہے۔

> "ہمارے مولوی حضرات بھی لسانی اور صوبائی عصبیتوں کے اتنے ہی اسیر ہیں جتنے دوسرے قوم پرست۔ نیو ورلڈ آرڈر ان کو آسانی سے شکار کر لے گا، یہ خود نیو ورلڈ آرڈر کے آلہ کار بن جائیں گے"

آج یہی قبضہ گروپ کراچی پر عذاب بن کر ٹوٹ پڑا ہے، کوئی داد فریاد نہیں ہے۔ کراچی والوں کا صرف اتنا قصور ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ قوم نے ہمیں جو مینڈیٹ دیا ہے اس کا احترام کیا جائے۔ ہمیں بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ آبادی کے تناسب سے ملازمتوں میں ہمیں بھی حصہ ملنا چاہئے۔ ہم بھی اس ملک کے شہری ہیں۔ ہمارے بھی وہی حقوق ہیں جو دوسروں کے ہیں۔ اس جرم کی اتنی بڑی سزا انہیں مل رہی ہے، جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا۔ قبضہ گروپ کے ہاتھ میں پولیس ہے، رینجرز ہیں، عقوبت خانے ہیں، عدیہ ہے اور ذرائع ابلاغ کے تمام ادارے ہیں، اس صورت میں کون کس سے فریاد کرے!

عذاب کے اعتبار سے کراچی ایک جزیرہ بنا ہوا ہے۔ ملک کے دوسرے حصے سے کوئی موثر صدائے احتجاج بلند ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ علاقائیت کی روح اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ اس میں سے اسلامی سوچ کو ڈھونڈھ نکالنا بڑا مشکل کام ہے۔ مثالیں تلخ ہیں مگر حقیقت ہے۔ کراچی میں روزانہ درجنوں افراد قتل کئے جا رہے ہیں مگر ردعمل ملک کے کسی گوشے سے نہیں ہوتا۔ یہ ردعمل اس وقت ہوتا ہے جب وقت کسی بھی دوسرے صوبے کے چند افراد لقمے اجل بن جاتے ہیں۔ یہ بہت ہی خطرناک علامت ہے۔ امت مسلمہ کو تباہ کرنے کا اس سے آسان نسخہ کوئی نہیں۔ حالات اگر اسی طرح چلتے رہے اور قبضہ گروپ کی بداعمالیاں اسی طرح جاری رہیں تو پاکستان کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ پھر یہ قبضہ گروپ بھی نہ بچ سکے گا۔

خیر کی قوتوں کے دعویدار مختلف خانوں میں تقسیم ہو چکے ہیں انہیں اپنے گھروندے اس ملک سے زیادہ عزیز ہیں۔ اپنے مسلکوں سے انہیں اس حد تک پیار ہے کہ ملک کی تعمیر کے لئے مل بیٹھنے کو تیار نہیں۔ ظلم کو وہ اس لئے ظلم نہیں کہتے کہ ظلم سہنے والوں نے انہیں ووٹ نہیں دیئے۔ بوسنیا، کشمیر اور صومالیہ کے لئے تڑپنے والے اپنے ملک میں ہونے والے مظالم پر منقار زیر پر ہیں یا کبھی کبھار بولتے بھی ہیں تو بات اس طرح لپیٹ دیتے ہیں کہ اس سے کوئی واضح مطلب اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ بات سیدھی ہے کہ جن لوگوں نے ہمیں ووٹ نہیں دیا ہے، ان سے ہمدردی کیا معنی!

(باقی صفحہ ۲۲ پر)